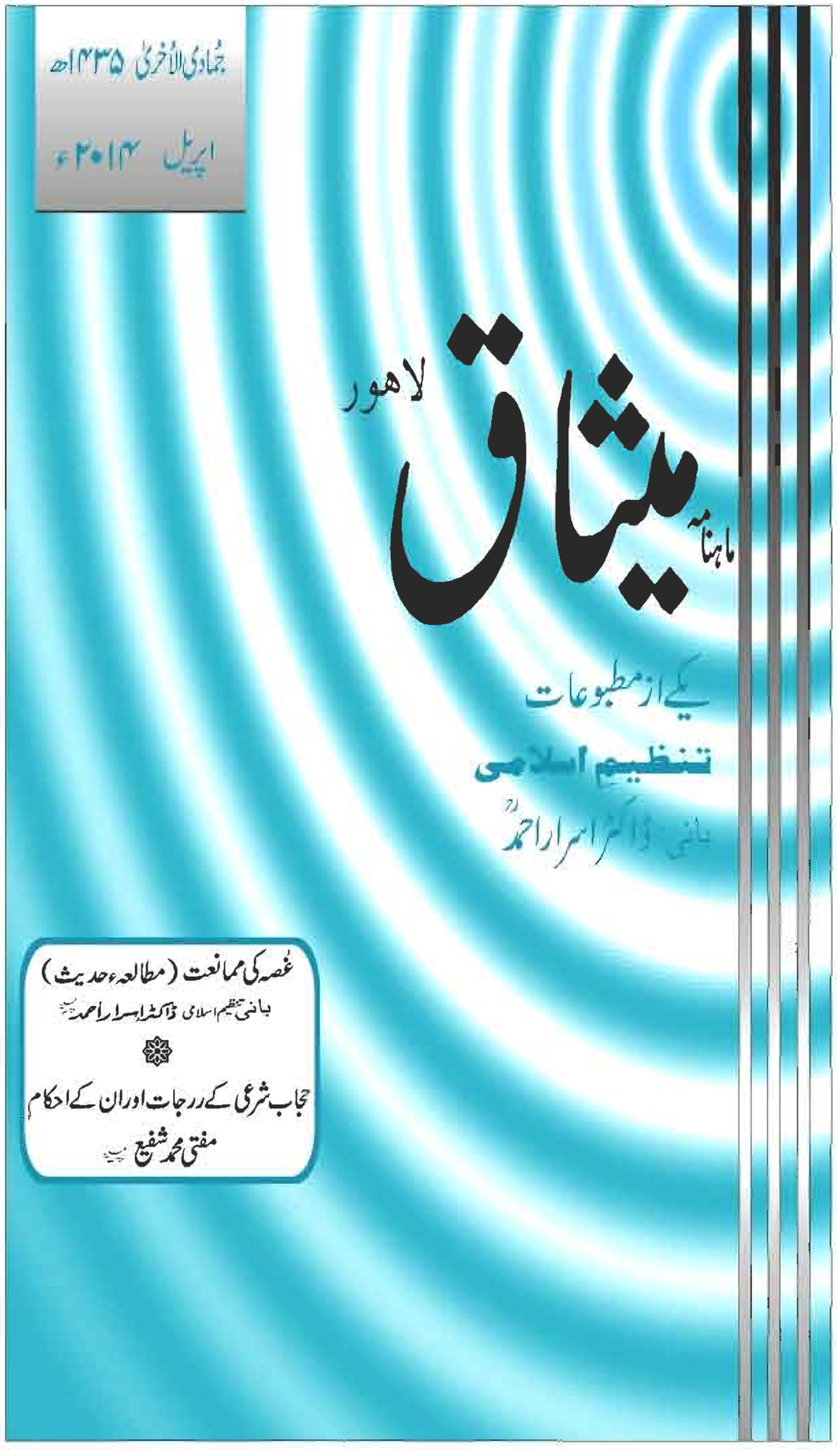

جُمادی الاُخریٰ ۱۴۳۵ھ

اپریل ۲۰۱۴ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

بانی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

غُصہ کی ممانعت (مطالعہ حدیث)

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

حجاب شرعی کے درجات اور ان کے احکام

مفتی محمد شفیعؒ

قرآن حکیم کی عظمت، تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیے۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 400 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 270 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-042-35869501

maktaba@tanzeem.org

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 63

شمارہ : 4

جُمادی الأُخریٰ 1435ھ

اپریل 2014ء

فی شمارہ 25/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

اندرون ملک	250 روپے
بھارت وبنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000 ' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ ' گڑھی شاہو لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ——— 5

اسلام کا عالمی غلبہ: ایک خواب یا حقیقت؟ — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ——— 7

سورۃ بنی اسراءیل (آیات ۱ تا ۲۲) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مطالعۂ حدیث ——— 29

غصہ کی ممانعت — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

پردۂ نسواں ——— 47

حجابِ شرعی کے درجات اور ان کے احکام کی تفصیل — مفتی محمد شفیعؒ

تفہیمُ القرآن ——— 54

منکرینِ حدیث کی گمراہی کے نتائج — سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تعمیرِ سیرت ——— 57

تزکیۂ نفس — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

حسنِ عبادت ——— 61

نماز کے آداب اور ہماری کوتاہیاں — حافظ محمد زاہد

دعوتِ فکر ——— 69

شیطانی حملہ: آدمؑ سے لے کر آج تک — پروفیسر عبداللہ شاہین

حقیقتِ انسان ——— 75

فلسفۂ موت وحیات — راحیل گوہر

گوشۂ خواتین ——— 84

خواتین کا عالمی دن — بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

❁ ❁ ❁

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اسلام کا عالمی غلبہ

ایک خواب یا حقیقت؟

اگرچہ اس وقت کفر بھی مکمل طور پر ''ملّتِ واحدہ'' کی صورت میں نظر نہیں آ رہا لیکن اُمّت مُسلمہ میں انتشار اور باہم دشمنی اپنے عروج پر ہے۔ پھر یہ کہ کُفّار اور اسلام دشمن قوتوں کے باہمی اختلافات سطحی ہیں اور وہ ان اختلافات کو تصادم اور جنگ و جدل کی صورت اختیار نہیں کرنے دیتے۔ ایک دوسرے کے حوالے سے صبر و تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک فریق اگر جارحیت کا مظاہرہ کرتا نظر آتا ہے تو دوسرا فریق زیادہ مشتعل ہونے کی بجائے کسی قدر پسپائی اختیار کر کے معاملات کو ایک حد سے زیادہ بگڑنے نہیں دیتا۔ ماضی میں ہم دیکھتے ہیں کہ کیوبا' یوگوسلاویہ اور مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ نے جارحانہ رویہ اختیار کیا تو سوویت یونین یا روس نے خونریز تصادم کی نوبت نہیں آنے دی اور مونچھ نیچے کر لی' اور تصادم ٹل گیا۔

حال ہی میں شام اور یوکرائن کے مسئلہ پر امریکہ اور روس کے مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہوا۔ دونوں طرف سے گرما گرم بیانات جاری ہوئے۔ شام میں بشار الاسد کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے امریکہ نے زبردست جارحانہ عزائم کا اظہار کیا۔ سعودی عرب کو ساتھ ملایا جسے اسد کی حکومت سے مذہبی اور بعض دوسرے حوالوں سے شدید اختلافات تھے۔ امریکہ نے سعودی حکومت کو یقین دلایا کہ وہ شام کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے خود فوجی کارروائی کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا' اگر سعودی حکومت جنگ کے اخراجات اپنے سر لے لے۔ سعودی حکومت بخوشی اس پر تیار ہو گئی۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ دنوں میں امریکہ شام پر حملہ کر دے گا' لیکن روس کھل کر سامنے آ گیا۔ دوسرے مسلمان ملک ایران کو اپنے ساتھ ملایا اور اعلان کر دیا کہ وہ اسد کی علوی حکومت کا مکمل تحفظ کریں گے۔ امریکہ نے روس کے تیور دیکھے تو سعودی عرب سے کیے گئے وعدہ سے منحرف ہو گیا اور اعلان کر دیا کہ وہ شام کی حکومت ختم کرنے کے لیے تمام ذرائع اختیار کرے گا' البتہ فوری طور پر کوئی فوجی کارروائی نہیں کرے گا۔ لہٰذا شام میں مسلمان

ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں' امریکہ اور روس اپنے اپنے گروہ کی حمایت کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی باہم خونریزی جاری ہے' لیکن امریکہ روس کا اس مسئلہ پر تصادم ٹل چکا ہے۔

یوکرائن میں امریکہ روس نواز حکومت کے خلاف تحریک چلانے والوں کی مدد کر رہا تھا' بالآخر وہ اس حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ روس نواز صدر اور وزیر اعظم دونوں یوکرائن سے فرار ہونے پر مجبور ہو گئے اور یوکرائن میں امریکہ نواز حکومت قائم ہو گئی۔ روس نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے یوکرائن کے صوبہ کریمیا پر حملہ کر دیا' جہاں کی آبادی روس نواز ہے۔ امریکہ نے اس حملہ پر سخت ترین بیانات جاری کیے' لیکن کوئی فوجی کارروائی نہیں کی' اور روس جوابی خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کریمیا سے آگے نہیں بڑھا۔ ہم ان تفصیلات سے اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ کفّار کے درمیان باہم اختلافات ہیں لیکن وہ انہیں ایک حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتے' لہٰذا جنگ و جدل اور خونریزی کی نوبت نہیں آتی۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کو لڑانے اور ان کے مفادات کو زک پہنچانے کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ غیر مسلم ممالک میں اپوزیشن اور حکومت اندرونی اور داخلی مسائل میں باہم سر پھٹول کرتے ہیں' لیکن ہر غیر ملکی دشمن کے خلاف یک جان دو قالب ہو جاتے ہیں۔

اب آیئے اُمت مسلمہ کی طرف۔ پہلے ایک نگاہ مشرقِ وسطیٰ پر ڈالیں۔ وہ عرب ممالک جو نصف صدی پہلے فلسطین کے مسئلہ پر اور اسرائیل کے قیام پر مرنے مارنے پر تیار رہتے تھے آج ایک دوسرے کی دشمنی میں اسرائیل سے نہ صرف تعاون کر رہے ہیں' بلکہ بڑھ چڑھ کر اس یہودی ریاست کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مصر الاخوان المسلمون کی بیخ کنی کرنے کے لیے اور مرسی کے حامیوں کے قتل عام میں اسرائیل سے افرادی اور تکنیکی مدد حاصل کر رہا ہے۔ سعودی عرب بھی اخوان کے قتل عام میں مصریوں کی پیٹھ ٹھونک رہا ہے۔ ایران اور عراق کے درمیان ایک خونریز جنگ چند سال پہلے ہو چکی ہے۔ امریکہ اس جنگ کو بڑھانے اور اسے تیز تر کرنے میں بڑا متحرک رہا۔ پھر عراق کو اُکسا کر کویت پر حملہ کروا دیا اور اس کی آڑ میں خود بھی عراق پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ کا خرچہ مکمل طور پر سعودی عرب نے برداشت کیا۔ علاوہ ازیں عربوں کو اسلحہ فروخت کر کے ان سے خوب نفع کمایا۔ سعودی عرب نے ایران کے خوف سے اپنے ملک میں امریکی فوج کو قیام کی اجازت دے دی۔ ایران اور سعودی عرب میں تعلقات انتہائی کشیدہ ہیں۔ ایران اور پاکستان کسی زمانے میں دوستی کا دم بھرتے تھے' آج دونوں کے

(باقی صفحہ 97 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃ بَنِی اِسرائِیل

تمہیدی کلمات

سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف دونوں مل کر ایک حسین وجمیل جوڑا بناتی ہیں۔ قرآن عظیم کے وسط میں یہ دو سورتیں حکمتِ قرآنی کے دو عظیم خزانے ہیں۔ ان دونوں کے مابین کئی حوالوں سے مشابہت بھی پائی جاتی ہے اور کئی پہلوؤں سے ان کی آپس میں نسبتِ زوجیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دونوں سورتیں کس کس اعتبار سے complementary حیثیت رکھتی ہیں یہ بات ان کے مطالعہ کے دوران واضح ہو جائے گی' تاہم اس سلسلے میں اہم نکات درج ذیل ہیں:

(۱) سورۂ بنی اسرائیل کا آغاز اللہ کی تسبیح ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ .....﴾ سے ہوتا ہے' جبکہ سورۃ الکہف بھی اللہ کی تحمید ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ.....﴾ سے شروع ہوتی ہے۔ ان دونوں کلمات کا باہمی تعلق اس حدیث سے واضح ہوتا ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ((اَلتَّسْبِیْحُ نِصْفُ الْمِیْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ یَمْلَؤُہٗ))(۱) ''تسبیح نصف میزان ہے اور الحمد لِلّٰہ اسے بھر دیتا ہے''۔ یعنی سبحان اللہ کہنے سے معرفتِ خداوندی کی میزان آدھی ہو جاتی ہے اور الحمد لِلّٰہ کہنے سے یہ میزان مکمل طور پر بھر جاتی ہے۔ گویا یہ دونوں کلمات مل کر کسی انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کے اثاثے کی تکمیل کرتے ہیں۔ آگے چل کر المُسَبِّحات (وہ سورتیں جن کا آغاز اللہ کی تسبیح سے ہوتا ہے) کے مطالعہ کے دوران اس مضمون پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

(۲) سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں مذکور ہے کہ ''اللہ اپنے بندے کو لے گیا'' جبکہ سورۃ الکہف کی پہلی آیت میں فرمایا کہ ''اللہ نے اپنے بندے پر کتاب اتاری''۔ گویا دونوں مقامات کی باہم متلازم (reciprocal) نسبت ہے۔

(۱) سنن الترمذی' ابواب الدعوات ۔ ومسند احمد' ح:۲۱۹۹۵۔

(۳) دونوں سورتوں کی ابتدائی آیات میں نبی اکرم ﷺ کے لیے رسول کے بجائے عبد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

(۴) سورۂ بنی اسرائیل کی آخری دو آیات کا آغاز لفظ ''قُلْ'' سے ہوتا ہے اور اسی طرح سورۃ الکہف کی آخری دو آیات بھی لفظ ''قُلْ'' سے شروع ہوتی ہیں۔ نیز ان دونوں مقامات کی دو دو آیات کے مضامین میں باہم متلازم (reciprocal) نسبت ہے۔

(۵) یہ دونوں سورتیں ریل کے ڈبوں کی طرح آپس میں جڑی ہوئی (inter locked) ہیں۔ وہ اس طرح کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت ایک حکم پر ختم ہو رہی ہے: ﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ.....﴾ ''اور کہیے کہ کُل حمد اور کُل تعریف اس اللہ کے لیے ہے.....'' جبکہ سورۃ الکہف کی پہلی آیت کے مضمون سے یوں لگتا ہے جیسے یہ اس حکم کی تعمیل میں نازل ہوئی ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ.....﴾۔

مضمون اور موضوع کے اعتبار سے سورۂ بنی اسرائیل کا پہلا رکوع بہت اہم اور عظیم ہے۔ اس رکوع میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے اُن چار ادوار کا تذکرہ ہے جو حضور ﷺ کی بعثت تک گزر چکے تھے۔ یہاں بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ کو چار آیات کے اندر سمو کر گویا امت مسلمہ کے لیے ایک آئینہ فراہم کر دیا گیا ہے۔ اس آئینے کو سامنے رکھ کر ہم اپنے ماضی' حال اور مستقبل کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس کی وضاحت اس حدیث نبوی ﷺ میں ملتی ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا:

((لَیَاْتِیَنَّ عَلٰی اُمَّتِیْ مَا اَتٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ.....)) (۱)

''میری اُمت پر بھی وہ تمام حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر وارد ہوئے' بالکل اسی طرح جیسے ایک جوتی دوسری جوتی کے مشابہ ہوتی ہے.....''

اس حدیث میں جوتی کے دونوں پاؤں کی مشابہت کی یہ مثال اس اٹل حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ عروج وزوال کے جو چار ادوار بنی اسرائیل پر گزر چکے ہیں بالکل ایسے ہی چار ادوار امتِ مسلمہ پر بھی وارد ہوں گے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو سورۂ بنی اسرائیل کی ان چار آیات (۴ تا ۷) میں علم ومعرفت اور معلومات کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے' جبکہ مذکورہ بالا

(۱) سنن الترمذی' ابواب الایمان' باب ما جاء فی افتراق هذه الامة

حدیث اس خزانے کی چابی ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے اس چابی کی مدد سے اس خزانے تک رسائی ملی ہے‘ جس کے نتیجے میں میرے لیے ان بیش بہا علمی و تاریخی معلومات کو ضبطِ تحریر میں لانا ممکن ہوا ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر میرا ایک مختصر کتابچہ ’’تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر‘‘ کے نام سے اور ایک مفصل کتاب ’’سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی‘ حال اور مستقبل‘‘ کے عنوان سے دستیاب ہیں۔

ان دونوں مطبوعات کے انگلش تراجم بھی Rise and Decline of the Muslim Ummah اور Lessons from Histroy کے عنوانات سے طبع ہوتے ہیں۔ (اس موضوع کو سمجھنے کے لیے ان کتب کا مطالعہ مفید ہوگا۔)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آیات ۱ تا ۱۰

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝۱ وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰہُ ھُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ط ۝۲ ذُرِّیَّۃَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ط اِنَّہٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا ۝۳ وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا ۝۴ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىھُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ ط وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝۵ ثُمَّ رَدَدْنَا لَکُمُ الْکَرَّۃَ عَلَیْھِمْ وَاَمْدَدْنٰکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَجَعَلْنٰکُمْ اَکْثَرَ نَفِیْرًا ۝۶ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ ق وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَھَا ط فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَۃِ لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْھَکُمْ وَلِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ کَمَا دَخَلُوْہُ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّلِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا ۝۷ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ ج وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ق وَجَعَلْنَا جَھَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ۝۸

اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا کَبِیْرًا ۝۹ وَّاَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝۱۰

آیت ۱ ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ ’’پاک ہے وہ ذات جو لے گئی راتوں رات اپنے بندے (ﷺ) کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ (دُور کی مسجد) تک‘‘

یہ رسول اللہ ﷺ کے سفر معراج کے پہلے مرحلے کی طرف اشارہ ہے جو مسجد حرام (مکہ مکرمہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک کے زمینی سفر پر مشتمل تھا۔ ’’سُبْحٰن‘‘ تنزیہہ کا کلمہ ہے‘ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہر نقص و عیب سے پاک و منزہ ہے۔ اس کلمہ سے بات کا آغاز کرنا خود دلالت کرتا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا خارقِ عادت واقعہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت سے رونما ہوا۔ یہ محض ایک روحانی تجربہ نہ تھا‘ بلکہ ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو کرایا۔

﴿الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ﴾ ’’جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا‘‘

اس علاقے کی برکت دنیوی اعتبار سے بھی ہے اور روحانی اعتبار سے بھی۔ دنیوی اعتبار سے یہ علاقہ بہت زرخیز ہے اور یہاں کی آب و ہوا خصوصی طور پر بہت اچھی ہے۔ روحانی اعتبار سے دیکھیں تو یہ علاقہ بہت سے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کا مسکن رہا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سمیت بہت سے انبیاء یہاں مدفون ہیں۔ ہیکل سلیمانی بنی اسرائیل کی مرکزی عبادت گاہ تھی۔ اس لحاظ سے نہ معلوم اللہ کے کیسے کیسے نیک بندے کس کس انداز میں یہاں عبادت کرتے رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ بیت المقدس کو بنی اسرائیل کے قبلہ کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ چنانچہ مادی و روحانی دونوں اعتبار سے اس علاقے کو اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ برکتوں سے نوازا ہے۔

سفر معراج کے پہلے مرحلے میں رسول اللہ ﷺ کو مکہ مکرمہ سے یروشلم لے جایا گیا‘ وہاں بیت المقدس میں تمام انبیاء کی ارواح کو جمع کیا گیا‘ انہیں جسد عطا کیے گئے (ہمارے حواس اس کیفیت کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں) اور وہاں حضور ﷺ نے تمام انبیاء کی امامت فرمائی۔ حضور ﷺ کے سفر معراج کے اس حصے کا ذکر جس انداز میں یہاں ہوا ہے اس کی ایک خصوصی

اہمیت ہے۔ یہ گویا اعلان ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ اور آپؐ کی امت کو توحید کے ان دونوں مراکز (بیت اللہ اور بیت المقدس) کا متولی بنایا جا رہا ہے۔ اسی حوالے سے آپ ﷺ کو پہلے بیت المقدس لے جایا گیا اور پھر وہاں سے آپ ﷺ کے آسمانی سفر کا مرحلہ شروع ہوا۔ سفرِ معراج کے اس دوسرے مرحلے کا ذکر بہت اختصار کے ساتھ سورۃ النجم میں کیا گیا ہے۔

﴿لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ①﴾ ''تا کہ ہم دکھائیں اُس (بندے محمد ﷺ) کو اپنی نشانیاں۔ یقیناً وہی ہے سب کچھ سننے والا' دیکھنے والا۔''

بنی اسرائیل کے اہم ترین تاریخی مقام کا ذکر کرنے کے بعد اب آئندہ آیات میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اُن کی تاریخ کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔

آیت ۲ ﴿وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ''اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب (تورات) دی اور ہم نے اُسے ہدایت بنایا بنی اسرائیل کے لیے''

یہاں تخصیص کر دی گئی کہ تورات تمام بنی نوعِ انسان کے لیے ہدایت نہیں تھی' بلکہ درحقیقت وہ صرف بنی اسرائیل کے لیے ایک ہدایت نامہ تھی۔

﴿اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ②﴾ ''کہ تم مت بناؤ میرے سوا کسی کو کارساز۔''

یعنی تورات توحید کا درس دیتی تھی۔ اس کی تعلیمات کا لُبِّ لُباب یہ تھا کہ اللہ کے سوا کسی بھی دوسری ہستی یا ذات کو اپنا کارساز مت سمجھو' اسے چھوڑ کر کسی دوسرے پر بھروسہ یا توکّل نہ کرو۔

آیت ۳ ﴿ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ③﴾ ''اے اُن لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے سوار کرایا تھا نوحؑ کے ساتھ۔ یقیناً وہؑ ہمارا بہت ہی شکر گزار بندہ تھا۔''

حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام' حام اور یافث تھے جن سے بعد میں نسل انسانی چلی۔ ان میں سے حضرت سام کی نسل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ جن کی اولاد کو یہاں بنی اسرائیل کے طور پر مخاطب کیا جا رہا ہے۔ انہیں یاد دلایا جا رہا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ جن لوگوں کو ہم نے بچایا تھا انہی میں سے ایک کی اولاد تم ہو اور نوحؑ ہمارا بہت ہی شکر گزار بندہ تھا۔

آیت ۴ ﴿وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ④﴾ ''اور ہم نے متنبّہ کر دیا تھا بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم

زمین میں دو مرتبہ فساد مچاؤ گے اور بہت بڑی سرکشی کرو گے۔''

یعنی تم پر دو ادوار ایسے آئیں گے کہ تم زمین میں سرکشی کرو گے' فساد برپا کرو گے' دین سے دور ہو جاؤ گے' لہو و لعب میں مبتلا ہو جاؤ گے' اور پھر اس کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے تم پر عذاب کے کوڑے برسیں گے۔

یہاں پر بین السطور یہ اشارہ بھی ہے کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل پر ایک بہتر دور بھی آیا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمتوں اور نعمتوں سے نوازا تھا۔ سورۃ البقرۃ میں ان کے اس اچھے دور کی کچھ تفصیلات ہم پڑھ آئے ہیں۔ یاد دہانی کے طور پر اہم واقعات اختصار کے ساتھ یہاں پھر تازہ کر لیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ۱۴۰۰ قبل مسیح میں بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلے تھے۔ صحرائے سینا میں جبل طور کے پاس پڑاؤ کے زمانے میں آپؑ کو تورات عطا کی گئی۔ وہاں سے پھر شمال مشرق کی طرف کوچ کرنے اور فلسطین پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا گیا۔ جہاد کے اس حکم سے انکار کی پاداش میں بنی اسرائیل کو صحرا نوردی کی سزا ملی۔ اسی دوران میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ صحرا نوردی کے دوران پروان چڑھنے والی نسل بہادر اور جفاکش تھی۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ حضرت یوشع بن نون کی سرکردگی میں جہاد کیا جس کے نتیجے میں فلسطین فتح ہو گیا۔ فلسطین کا جو شہر سب سے پہلے فتح ہوا وہ اریحا (Jericho) تھا۔ فلسطین کی فتح کے بعد ایک بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ ایک مضبوط مرکزی حکومت بنانے کے بجائے یہ علاقہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں نے آپس میں بانٹ لیا اور ہر قبیلے نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں نہ صرف بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں بہت کمزور تھیں بلکہ بہت جلد انہوں نے آپس میں بھی لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا' جس کے نتیجے میں ان کے زیر تسلط علاقے بہت جلد انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار ہو گئے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے شام اور اُردن کے ہمسایہ علاقوں میں بسنے والی مشرک اقوام نے ان پر تسلط حاصل کر کے ان کی بیشتر آبادی کو اس علاقے سے نکال باہر کیا۔

اس حالت کو پہنچنے پر انہوں نے اپنے نبی حضرت سموئیلؑ سے مطالبہ کیا کہ اُن کے لیے ایک بادشاہ یا سپہ سالار مقرر کر دیں تا کہ اس کی قیادت میں تمام قبیلے اکٹھے ہو کر جہاد کریں۔ اس مطالبے کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت طالوت کو اُن کا بادشاہ مقرر کیا گیا۔ حضرت طالوت نے دشمن افواج کے خلاف لشکر کشی کی' جن کا سپہ سالار جالوت تھا۔ اس جنگ

میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی شامل تھے۔ آپؑ نے جالوت کو قتل کر دیا' جس کے نتیجے میں دشمن لشکر پر بنی اسرائیل کو فتح نصیب ہوئی اور وہ علاقے میں ایک مضبوط حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت طالوت کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام ان کے جانشین ہوئے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد آپؑ کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ بنے۔

حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین کے فتح ہونے سے لے کر طالوت اور جالوت کی جنگ تک تین سو سال کا وقفہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا عہدِ حکومت اس تین سو سالہ دور کا نقطۂ عروج تھا۔ حضرت طالوت' حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا دورِ اقتدار تقریباً ایک سو سال کے عرصے پر محیط تھا۔ سولہ برس تک حضرت طالوت نے حکومت کی' اس کے بعد چالیس برس تک حضرت داؤدؑ اور پھر چالیس برس تک ہی حضرت سلیمانؑ برسر اقتدار رہے۔ یہ دور گویا بنی اسرائیل کی خلافتِ راشدہ کا دور تھا جو ہمارے دورِ خلافتِ راشدہ سے مماثلت رکھتا ہے۔ اگرچہ ان کی پہلی تین خلافتیں ایک سو برس کے عرصے پر محیط تھیں اور ہماری امت کی پہلی تین خلافتوں کا عرصہ چوبیس برس تھا' لیکن جس طرح اُن کے پہلے خلیفہ کا دورِ اقتدار مختصر اور بعد کے دونوں خلفاء کا دور نسبتاً طویل تھا اسی طرح ہمارے ہاں بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت مختصر' جبکہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا دور نسبتاً طویل تھا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے قبول نہیں کیا تھا' چنانچہ شام اور مصر کے علاقے علیحدہ رہے تھے' بالکل اسی طرح بنی اسرائیل کی مملکت بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد آپؑ کے دو بیٹوں کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ شمالی مملکت کا نام اسرائیل تھا جس کا دارالخلافہ سامریہ تھا' جبکہ جنوبی مملکت کا نام یہودیہ تھا اور اس کا دارالخلافہ یروشلم تھا۔

اس عظیم سلطنت کی تقسیم کے بعد بھی مادی اعتبار سے ایک عرصے تک بنی اسرائیل کا عروج برقرار رہا' لیکن رفتہ رفتہ عوام میں مشرکانہ عقائد' اوہام پرستی اور ہوسِ دنیا جیسی نظریاتی و اخلاقی بیماریاں پیدا ہو گئیں' اور احکامِ شریعت کا استہزا ان کا اجتماعی وطیرہ بن گیا۔ چنانچہ اخلاق و کردار کا یہ زوال منطقی طور پر ان کے مادی زوال پر منتج ہوا۔ بنی اسرائیل کا یہ عہدِ زوال بھی تقریباً تین سو سال ہی کے عرصے میں اپنی انتہا کو پہنچا۔ سب سے پہلے آشوریوں کے ہاتھوں ان کی شمالی سلطنت ''اسرائیل'' (سات آٹھ سو قبل مسیح کے لگ بھگ) تباہ ہوئی۔ اس کے بعد ۵۸۷ قبل مسیح میں عراق کے نمرود بخت نصر (Nebukadnezar) نے ان کی جنوبی

سلطنت ''یہودیہ'' پر حملہ کیا اور پوری سلطنت کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ یروشلم کو اس طرح تباہ و برباد کیا گیا کہ کسی عمارت کی دو اینٹیں بھی سلامت نہیں رہنے دی گئیں۔ ہیکل سلیمانی کو مسمار کر کے اس کی بنیادیں تک کھود ڈالی گئیں۔ اس دوران بخت نصر نے چھ لاکھ یہودیوں کو قتل کیا جبکہ چھ لاکھ مردوں' عورتوں اور بچوں کو جانوروں کی طرح ہانکتا ہوا بابل لے گیا' جہاں یہ لوگ سوا سو سال تک اسیری (Captivity) کی حالت میں رہے۔ ذلت و رسوائی کے اعتبار سے یہ ان کی تاریخ کا بدترین دور تھا۔

بنی اسرائیل کے دوسرے دورِ عروج کا آغاز حضرت عزیر علیہ السلام کی اصلاحی کوششوں سے ہوا۔ آپؑ کو بنی اسرائیل کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے نقیب کی حیثیت حاصل ہے۔ ۵۳۹ ق م میں ایران کے بادشاہ کیخورس (Cyrus) یا ذوالقرنین نے عراق (بابل) فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی عام اجازت دے دی۔ چنانچہ یہودیوں کے قافلے فلسطین جانے شروع ہو گئے اور یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ ۴۵۸ ق م میں حضرت عزیر علیہ السلام بھی ایک جلاوطن گروہ کے ساتھ یروشلم پہنچے اور اس شہر کو آباد کرنا شروع کیا اور ہیکل سلیمانی کی ازسرنو تعمیر کی۔ اس سے قبل حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سو برس تک سلائے بھی رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سو سال کے لیے موت طاری کر دی تھی اور پھر انہیں زندہ کیا اور انہیں بچشم سران کے مردہ گدھے کے زندہ ہونے کا مشاہدہ کرایا' جس کے بارے میں ہم سورۃ البقرۃ (آیت ۲۵۹) میں پڑھ آئے ہیں۔ بہرحال حضرت عزیر علیہ السلام نے توبہ کی منادی کے ذریعے ایک زبردست تجدیدی اور اصلاحی تحریک چلائی جس کے نتیجے میں ان کے نظریات اور اعمال و اخلاق کی اصلاح ہونا شروع ہوئی۔ حضرت عزیر علیہ السلام نے تورات کو بھی یاداشتوں کی مدد سے ازسرنو مرتّب کیا جو بخت نصر کے حملے کے دوران گم ہو گئی تھی۔

ایرانی سلطنت کے زوال' سکندر مقدونی کی فتوحات اور پھر یونانیوں کے عروج سے یہودیوں کو کچھ مدت کے لیے شدید دھچکا لگا۔ یونانی سپہ سالار انیٹوکس ثالث نے ۱۹۸ ق م میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ یونانی فاتحین نے پوری جابرانہ طاقت سے کام لے کر یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کرنا چاہی' لیکن بنی اسرائیل اس جبر سے مغلوب نہ ہوئے اور ان کے اندر ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں ''مکّابی بغاوت'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ حضرت

عزیرؑ کی پھونکی ہوئی روحِ دینداری کا اثر تھا کہ انہوں نے بالآخر یونانیوں کو نکال کر اپنی ایک عظیم آزاد ریاست قائم کر لی جو ''مکابی سلطنت'' کہلاتی ہے۔ بنی اسرائیل کے دوسرے دورِ عروج میں قائم ہونے والی یہ سلطنت ۱۷۰ ق م سے لے کر ۶۷ ق م تک پوری شان وشوکت کے ساتھ قائم رہی۔ مکابی سلطنت اپنے وقت کی معلوم دنیا کے تمام علاقوں پر محیط تھی۔ چنانچہ رقبے کے اعتبار سے یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت سے بھی وسیع تھی۔ اس زمانہ عروج میں پھر سے ان کی نظریاتی واخلاقی حالت بگڑنے لگی۔ مشرکانہ عقائد سمیت بہت سی اخلاقی برائیاں پھر سے اُن میں پیدا ہوگئیں' جن کے نتیجے میں ایک دفعہ پھر یہ قوم عذاب خداوندی کی زد میں آ گئی۔

مکابی تحریک جس اخلاقی ودینی روح کے ساتھ اٹھی تھی وہ بتدریج فنا ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ خالص دنیا پرستی اور بے روح ظاہر داری نے لے لی۔ آخر کار ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور انہوں نے خود رومی فاتح پومپئی کو فلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پومپئی نے ۶۳ ق م میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ رومیوں نے فلسطین میں اپنے زیرسایہ ایک دیسی ریاست قائم کر دی جو بالآخر ۴۰ ق م میں ہیرود نامی ایک ہوشیار یہودی کے قبضے میں آئی۔ یہ شخص ہیرود اعظم کے نام سے مشہور ہے اور اس کی فرماں روائی پورے فلسطین اور شرقِ اردن پر ۴۰ سے ۴ ق م تک رہی۔ اس شخص نے رومی سلطنت کی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر کے قیصر کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ اس زمانے میں یہودیوں کی دینی واخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حد کو پہنچ گئی تھی۔ ہیرود اعظم کے بعد اس کی ریاست اس کے تین بیٹوں کے درمیان تقسیم ہوگئی۔ لیکن ۶ء میں قیصر آگسٹس نے ہیرود کے بیٹے ارخلاؤس کو معزول کر کے اس کی پوری ریاست اپنے گورنر کے ماتحت کر دی اور ۴۱ء تک یہی انتظام قائم رہا۔ یہی زمانہ تھا جب حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے اٹھے تو یہودیوں کے تمام مذہبی پیشواؤں نے مل کر ان کی مخالفت کی اور انہیں واجب القتل قرار دے کر رومی گورنر پونٹس پیلاطس سے ان کو سزائے موت دلوانے کی کوشش کی اور اپنے خیال کے مطابق تو ان کو سولی پر چڑھوا ہی دیا۔

رومیوں نے ۴۱ء میں ہیرود اعظم کے پوتے ''ہیرود اگرپا'' کو ان تمام علاقوں کا حکمران بنا دیا جن پر ہیرود اعظم اپنے زمانے میں حکمران تھا۔ اس شخص نے برسر اقتدار آ کر مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر مظالم کی انتہا کر دی۔ کچھ ہی عرصے بعد یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کشمکش

شروع ہوگئی اور ۶۴ء تا ۶۶ء کے دوران یہودیوں نے رومیوں کے خلاف کھلی بغاوت کر دی' جو اُن کے عروج ثانی کے خاتمے پر منتج ہوئی۔ یہودیوں کی بغاوت کا قلع قمع کرنے کے لیے بالآخر رومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کارروائی کی اور ۷۰ء میں ٹائٹس (Titus) نے بزورِ شمشیر یروشلم کو فتح کر لیا۔ ہیکل سلیمانی ایک دفعہ پھر مسمار کر دیا گیا۔ جنرل ٹائیٹس کے حکم پر شہر میں قتل عام ہوا۔ ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودی قتل ہوئے' جبکہ ۶۷ ہزار کو غلام بنا لیا گیا۔ اس طرح رومیوں نے پورے شہر میں کوئی متنفس باقی نہ چھوڑا۔ اس کے ساتھ ہی ارضِ فلسطین سے بنی اسرائیل کا عمل دخل مکمل طور پر ختم ہوگیا۔ بیسویں صدی کے شروع تک پورے دو ہزار برس یہ لوگ جلاوطنی اور انتشار (Diaspora) کی حالت میں ہی رہے۔ جنرل ٹائیٹس کے ہاتھوں ۷۰ء میں ہیکل سلیمانی مسمار ہوا تو آج تک تعمیر نہ ہو سکا۔ حضور ﷺ کی پیدائش (۵۷۱ء) کے وقت اسے مسمار ہوئے پانچ سو برس گزر چکے تھے۔

یہ خلاصہ ہے اُس قوم کی داستانِ عبرت کا جو اپنے وقت کی امتِ مسلمہ تھی۔ جس کے اندر چودہ سو برس تک مسلسل نبوت رہی۔ جس کو تین الہامی کتابوں سے نوازا گیا اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (البقرۃ) ''اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم لوگوں کو عطا کی اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت دی تمام جہانوں والوں پر۔''

آخر کار بنی اسرائیل کو اُمتِ مسلمہ کے منصب سے معزول کر کے محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمت کو اس مسندِ فضیلت پر متمکن کیا گیا۔ حضور ﷺ نے اپنی اُمت کے بارے میں فرمایا کہ تم لوگوں پر بھی عین وہی حالات وارد ہوں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مسلمانوں کو پہلا عروج عربوں کے زیر قیادت نصیب ہوا۔ اس کے بعد جب زوال آیا تو صلیبیوں کی یلغار کی صورت میں ان پر عذاب کے کوڑے برسے۔ پھر تاتاریوں نے ہلاکو خان اور چنگیز خاں کی قیادت میں عالم اسلام کو تاخت وتاراج کیا۔ اس کے بعد قدرت نے عالمِ اسلام کی قیادت عربوں سے چھین کر انہی تاتاریوں کے ہاتھوں میں دے دی' جنہوں نے لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا تھا۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

چنانچہ ترکوں کی قیادت میں اس اُمت کو ایک دفعہ پھر عروج نصیب ہوا۔ ترکانِ تیموری' ترکانِ

صفوی‘ ترکانِ سلجوقی اور ترکانِ عثمانی نے دنیا میں عظیم الشان حکومتیں قائم کیں۔ اس کے بعد اُمت مسلمہ پر دوسرا دورِ زوال آیا۔ بنی اسرائیلؑ پر دوسرا دورِعذاب یونانیوں اور رومیوں کے ہاتھوں آیا تھا جبکہ اُمتِ مسلمہ پر دوسرا عذاب اقوامِ یورپ کے تسلط کی صورت میں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انگریز‘ فرانسیسی‘ اطالوی‘ ہسپانوی اور ولندیزی (Dutch) پورے عالمِ اسلام پر قابض ہوگئے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عظیم عثمانی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

یہ ان حالات و واقعات کا خلاصہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے آیت زیرِنظر میں فرمایا ہے کہ ہم نے تو پہلے ہی بنی اسرائیل کے بارے میں کہہ دیا تھا کہ تم لوگ اپنی تاریخ میں دو دفعہ فساد مچاؤ گے اور سرکشی دکھاؤ گے۔

آیت ۵ ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ؕ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝۵﴾ ’’پھر جب ان دونوں میں سے پہلے وعدے کا وقت آ گیا تو ہم نے تم پر مسلط کر دیے اپنے سخت جنگجو بندے تو وہ تمہاری آبادیوں میں گھس گئے‘ اور (یوں ہمارا) جو وعدہ تھا وہ پورا ہو کر رہا۔‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تم پر واضح کیا گیا تھا کہ جب تم لوگ دین سے برگشتہ ہو جاؤ گے‘ جب تم اللہ کی کتاب اور اس کے احکام کو ہنسی مذاق بنا لو گے تو تم ضرور اللہ کے عذاب کا نشانہ بنو گے۔ چنانچہ ان کے دین سے برگشتہ ہو جانے کے بعد آشوریوں اور عراق کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں ان پر عذاب کا کوڑا برسا‘ جس کے نتیجے میں دونوں اسرائیلی سلطنتیں ختم ہوگئیں‘ یروشلم مکمل طور پر تباہ ہوگیا‘ ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا گیا‘ چھ لاکھ یہودی قتل ہو گئے جبکہ چھ لاکھ کو غلام بنا لیا گیا۔

آیت ۶ ﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ﴾ ’’پھر ہم نے تمہاری باری لوٹائی ان پر‘‘

یعنی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ پھر تمہیں سہارا دیا اور ان پر غلبے کا موقع عطا کر دیا۔ اس سہارے کا باعث ایرانی بادشاہ کیخورس (Cyrus) یا ذوالقرنین بنا۔ اس نے عراق (بابل) پر تسلط حاصل کر لینے کے بعد تمہیں آزاد کر کے واپس یروشلم جانے اور اس شہر کو ایک دفعہ پھر سے آباد کرنے کی اجازت دے دی۔ پھر جب تم نے واپس آ کر یروشلم کو آباد کیا تو ہم نے ایک دفعہ پھر تمہاری مدد کی:

﴿وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝۶﴾ ’’اور ہم نے مدد کی

تمہاری مال و دولت اور بیٹوں کے ذریعے سے اور بنا دیا تمہیں کثیر تعداد (والی قوم)۔‘‘

ہم نے تمہیں مال و اولاد میں برکت دی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ تم لوگ خوب پھلے پھولے اور جلد ہی ایک مضبوط قوم بن کر اُبھرے۔

آیت ۷ ﴿اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۫ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ﴾ ’’اگر تم نے کوئی بھلائی کی تو خود اپنے ہی لیے کی‘ اور اگر کوئی برائی کمائی تو وہ بھی اپنے ہی لیے کمائی۔‘‘

تمہارے نیک اعمال کا فائدہ بھی تمہیں ہوا اور تمہاری برائیوں اور نافرمانیوں کا وبال دنیا میں بھی تم پر آیا اور اس کا وبال آخرت میں بھی تم پر پڑے گا۔

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ﴾ ’’پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا‘‘

جب دوبارہ تم نے اللہ کے دین سے سرکشی اختیار کی‘ تمہارے اعتقادات‘ نظریات اور اخلاق پھر سے مسخ ہوگئے تو وعدے کے عین مطابق تم پر عذاب کے دوسرے مرحلے کا وقت آ پہنچا۔

﴿لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ﴾ ’’تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں‘‘

اس سلسلے میں آیت ۵ میں یہ الفاظ آئے تھے: ﴿بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ﴾ کہ ہم نے تم پر اپنے بندے مسلط کر دیے جو سخت جنگجو تھے۔ اس فقرے کا مفہوم یہاں بھی پایا جاتا ہے‘ لیکن یہاں دوبارہ اسے دہرایا نہیں گیا۔ چنانچہ اس فقرے کو یہاں محذوف سمجھا جائے گا اور آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ ہم نے پھر تم پر اپنے سخت جنگجو بندے مسلط کیے تاکہ وہ تمہارے حلیے بگاڑ دیں۔

﴿وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ ’’اور وہ داخل ہو جائیں مسجد میں جیسے کہ داخل ہوئے تھے پہلی مرتبہ‘‘

یہاں اشارہ ہے بیت المقدس اور ہیکل سلیمانی کی بارِ دگر بے حرمتی کی طرف۔ جیسے ۵۸۷ قبل مسیح میں بخت نصر نے بیت المقدس اور ہیکل سلیمانی کو مسمار کیا تھا‘ ویسے ہی رومی جرنیل ٹائیٹس نے ۷۰ء میں ایک دفعہ پھر ان کے تقدس کو پامال کیا۔

﴿وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝۷﴾ ’’اور تباہ و برباد کر کے رکھ دیں (ہر اُس شے کو) جس کے اوپر بھی انہیں قبضہ حاصل ہو جائے۔‘‘

ان آیات میں بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ کے نشیب و فراز کی تفصیلات کو سمو دیا گیا

ہے۔اس عرصے میں انہوں نے دو مرتبہ عروج دیکھا اور دو دفعہ ہی زوال سے دوچار ہوئے۔ نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت کے زمانے میں ان آیات کے نزول کے وقت ان کے دوسرے دورِ زوال کو شروع ہوئے پانچ سو برس ہونے کو آئے تھے۔اس سیاق وسباق میں انہیں متنبہ کیا جارہا ہے کہ:

آیت ۸ ﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ﴾ ''ہوسکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے' اور اگر تم نے وہی روش اختیار کی تو ہم بھی وہی کچھ کریں گے۔''

اگر تم نے پہلے کی طرح ہماری نافرمانیوں اور احکام شریعت سے اعراض کی روش اختیار کی تو ہم بھی اسی طرح پھر تمہیں سزا دیں گے۔

﴿وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝۸﴾ ''اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے۔''

نافرمانیوں کی سزا دنیا میں تو ملے گی ہی' جبکہ جہنم کا عذاب اس کے علاوہ ہوگا۔جس طرح جانوروں کو گھیر کر باڑے میں بند کر دیا جاتا ہے اسی طرح آخرت میں اللہ کے نافرمانوں کو اکٹھا کر کے جہنم کے قید خانے میں دھکیل دیا جائے گا۔(اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْنَا مَعَھُمْ!)

آیت ۹ ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ ''یقیناً یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے''

یاد رکھو! اب راہِ ہدایت وہی ہوگی جس کی نشان دہی یہ کتاب کرے گی جسے ہم اپنے آخری رسول ﷺ پر نازل کر رہے ہیں۔اب اللہ تعالیٰ کے قصرِ رحمت میں داخل ہونے کا ''شاہدرہ'' ایک ہی ہے اور وہ ہے یہ قرآن۔اب اگر تم اللہ کے دامن رحمت میں پناہ لینا چاہتے ہو تو اس قرآن کے راستے سے ہو کر آؤ۔اگر ایسا کرو گے تو اللہ کی رحمت کے دروازے ایک بار پھر تمہارے لیے کھل جائیں گے اور جو رفعتیں اور برکتیں اس آخری نبی ﷺ کی اُمت کے لیے لکھی گئی ہیں تم بھی ان میں حصہ دار بن جاؤ گے۔

﴿وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝۹﴾ ''اور بشارت دیتا ہے اُن اہل ایمان کو جو نیک عمل بھی کریں کہ اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

آیت ۱۰ ﴿وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۰﴾ ''اور یہ کہ

جو لوگ ایمان نہیں رکھتے آخرت پر' اُن کے لیے ہم نے تیار کر رکھا ہے ایک دردناک عذاب۔''

یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ جہاں کہیں بھی اعمال کی خرابی کی بات ہوتی ہے وہاں ایمان بالآخرت کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔

اس رکوع کے حوالے سے یہ بات بہت اہم ہے کہ یہاں بنی اسرائیل کے عروج وزوال کے آئینے میں جو تصویر دکھائی گئی ہے اس میں ہمارے لیے ایک دعوتِ فکر ہے۔الحمدللہ! آج ہم (امتِ محمد ﷺ) اُمت مسلمہ ہیں' لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک زمانے میں بنی اسرائیل بھی اُمتِ مسلمہ ہی تھے۔وہ بحیثیت نسل آج بھی ایک قوم کے طور پر موجود ہیں مگر انہیں اُمت مسلمہ کے منصب سے معزول کر دیا گیا ہے۔اب ان لوگوں کی حیثیت سابقہ اُمتِ مسلمہ کی ہے اور پچھلے دو ہزار برس سے یہ لوگ بہت زیادہ سختیوں کا شکار رہے ہیں۔ہمیں ان کی قومی تاریخ کے نشیب وفراز کا جائزہ لے کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کون کون سے عوامل تھے اور ان کے عقائد واعمال کی وہ کون سی خرابیاں تھیں جن کے باعث وہ لوگ اللہ کے ہاں مغضوب و معتوب ٹھہرے۔

یہاں دوسرا نکتہ یہ ذہن نشین کرنے کے لائق ہے کہ سابقہ اور موجودہ اُمتوں کے درمیان مقابلے کے لیے میدان تیزی سے تیار ہو رہا ہے اور یوں سمجھئے کہ دو پتنگیں اوپر چڑھ رہی ہیں' جن کے درمیان پیچ پڑنے والا ہے۔بنی اسرائیل اپنے انتہائی زوال کو پہنچنے کے بعد بحیثیت ایک قوم کے پچھلے ایک سو سال سے مادی لحاظ سے رو بہ ترقی ہیں۔ان کی پتنگ ۱۹۱۷ء میں بالفور (Balfor) ڈیکلریشن کی منظوری سے اوپر چڑھنا شروع ہوئی اور ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی ریاست معرضِ وجود میں آ گئی۔۱۹۶۶ء میں اس کی مزید توسیع عمل میں آئی اور اس کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے غیر معمولی اقدامات کیے گئے۔عرب دنیا کا واحد ملک عراق تھا جس سے اسرائیل کو خطرہ ہوسکتا تھا' اسے باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت تباہ و برباد کر دیا گیا ہے۔اس کے بعد اس پورے خطے میں اب کوئی ایسا ملک نہیں جو اسرائیل کی طاقت کو چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

دوسری طرف دیکھا جائے تو مسلم دنیا بھی اپنے زوال کی آخری حدوں کو چھونے کے بعد اب بیداری کی طرف مائل ہے اور اس اُمت کے اندر نئی زندگی پیدا ہونے کا وقت قریب نظر آتا ہے۔پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ گویا ہمارے زوال کی

انتہا تھی۔ اس کے بعد عالم اسلام میں آزادی کی تحریکیں چلیں اور متعدد مسلم ممالک یورپی اقوام کے تسلط سے آزاد ہو گئے۔ مزید برآں اُمتِ مسلمہ میں بہت سی احیائی تحریکیں اٹھیں' مثلاً پاک و ہند میں جماعت اسلامی' مصر میں الاخوان المسلمون' ایران میں فدائی تحریک اور انڈونیشیا میں مسجومی پارٹی وغیرہ' اور اس طرح اس کی نشأۃِ ثانیہ کے عمل کا آغاز ہو گیا۔ چنانچہ پچھلی صدی سے اُمتِ مسلمہ کی صفوں میں زوال اور احیائی عمل پہلو بہ پہلو چل رہے ہیں۔ جیسے سورۃ الرحمٰن میں متوازی چلنے والے دو دریاؤں کی مثال دی گئی ہے: ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿١٩﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿٢٠﴾﴾ ''اس نے دو دریا رواں کیے جو آپس میں ملتے ہیں۔ دونوں میں ایک آڑ ہے کہ (اس سے) تجاوز نہیں کر سکتے''۔ اب صورت حال یہ ہے کہ سابقہ اور موجودہ اُمتِ مسلمہ کی صورت میں دو تہذیبیں فضا میں تیر رہی ہیں اور ان کا آپس میں کسی وقت بھی پیچ پڑ سکتا ہے۔

یہ تمام تفصیلات ان لوگوں کے علم میں ہونی چاہئیں جو دین کی خدمت میں مصروف ہیں۔ انہیں زمان و مکان کے اعتبار سے درست ادراک ہونا چاہیے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں' ان کے دائیں بائیں کیا حالات ہیں؟ ماضی میں کیا ہوتا رہا ہے' ابھی سامنے کیا کچھ ہے اور مستقبل میں کیا امکانات ہیں؟

آیات ۱۱ تا ۲۲

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿١١﴾ وَجَعَلْنَا
الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا
فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ
فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿١٢﴾ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿١٣﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ
حَسِيْبًا ﴿١٤﴾ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ
عَلَيْهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ

رَسُوْلًا ﴿١٥﴾ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ
عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿١٦﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ
نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ﴿١٧﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ
عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا
مَّدْحُوْرًا ﴿١٨﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ
سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿١٩﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ
عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿٢٠﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ
اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿٢١﴾ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا
مَّخْذُوْلًا ﴿٢٢﴾

آیت ۱۱ ﴿وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ﴾ ''اور انسان شر مانگ بیٹھتا ہے (اپنے نزدیک) بھلائی مانگتے ہوئے۔''

یعنی انسان اللہ سے دعا کر رہا ہوتا ہے کہ اے اللہ! میرے لیے یوں کر دے' یوں کر دے۔ حالانکہ اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ جو کچھ وہ اپنے لیے مانگ رہا ہے وہ اس کے لیے مفید ہے یا مضر۔ اس طرح انسان اپنے لیے اکثر وہ کچھ مانگ لیتا ہے جو اس کے لیے الٹا نقصان دہ ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا ہے: ﴿عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾﴾ ''ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو' اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے شر ہو' اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے''۔ چنانچہ بہتر لائحہ عمل یہ ہے کہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے انسان اپنے معاملات اس کے حوالے کر دے کہ اے اللہ! میرے معاملات تیرے سپرد ہیں' کیونکہ میرے نفع و نقصان کو تو مجھ سے بہتر جانتا ہے: ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حسابِ کم و بیش را!

دعائے استخارہ میں بھی ہمیں تفویض امر کا یہی انداز سکھایا گیا ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْئَلُكَ مِنْ
فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ، فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ

عَلَّامُ الْغُیُوْبِ (۱)

''اے اللہ! میں تیرے علم کی بدولت تجھ سے خیر چاہتا ہوں اور تیری قدرت کی برکت سے طاقت مانگتا ہوں اور تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے فضل عظیم کا' بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں' تو سب کچھ جانتا ہے اور میں کچھ بھی نہیں جانتا' اور تو ہر قسم کے غیب کو جاننے والا ہے۔''

بہر حال انسان کا عمومی رویہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرنے کے بجائے اپنی عقل اور سوچ پر انحصار کرتا ہے اور اس طرح اپنے لیے خیر کی جگہ شر کی دعائیں کرتا رہتا ہے۔

﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝۱۱﴾ ''اور انسان بہت جلد باز ہے۔''

اپنی اس جلد بازی اور کوتاہ نظری کی وجہ سے وہ شر کو خیر اور خیر کو شر سمجھ بیٹھتا ہے۔

آیت ۱۲ ﴿وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ''اور ہم نے بنایا رات اور دن کو دو نشانیاں' تو تاریک کر دیا ہم نے رات کی نشانی کو اور روشن بنا دیا ہم نے دن کی نشانی کو' تا کہ تم تلاش کرو اپنے رب کا فضل''

دن کو روشن بنایا تا کہ اس کی روشنی میں تم لوگ آسانی سے کسب معاش کے لیے دوڑ دھوپ کر سکو۔

﴿وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ۝۱۲﴾

''اور تا کہ تم جان لو سالوں کی گنتی اور (نظام الاوقات کا) حساب' اور ہر چیز کو ہم نے کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔''

یہ دن اور رات کا الٹ پھیر ہی ہے جو نظام الاوقات کا بنیادی ڈھانچہ فراہم کرتا ہے اور دنوں سے ہفتے' مہینے اور پھر سال بنتے ہیں۔

آیت ۱۳ ﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰۗىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ﴾ ''اور ہر انسان کی قسمت چپکا دی ہے ہم نے اس کی گردن میں۔''

''طائر'' کا لفظ عربی میں عام طور پر شگون' نحوست اور بدقسمتی کے لیے بولا جاتا ہے'

(۱) صحیح البخاری' کتاب الدعوات' باب الدعاء عند الاستخارۃ۔وسنن الترمذی' ابواب الصلاۃ' باب ما جاء فی صلاۃ الاستخارۃ۔

لیکن یہاں پر خوش بختی اور بدبختی دونوں ہی مراد ہیں۔یعنی کسی انسان کا جو بھی مقسوم و مقدور ہے' زندگی میں اچھا برا جو کچھ بھی اسے ملنا ہے' جیسے بھی اچھے برے حالات اسے پیش آنے ہیں' اس سب کچھ کے بارے میں اس کا جو کھاتہ ''اُمّ الکتاب'' میں موجود ہے اس کا حاصل اس کی گردن میں چپکا دیا گیا ہے۔گردن میں چپکانے کے الفاظ کا استعمال محاورۃً بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی کچھ مادی حقیقت بھی ہو۔یعنی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی گردن میں کسی gland کی صورت میں واقعی کوئی مائیکرو کمپیوٹر نصب کر رکھا ہو۔واللہ اعلم!

﴿وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝۱۳﴾ ''اور ہم نکال لیں گے اس کے لیے قیامت کے روز (اسے) ایک کتاب (کی شکل میں)' وہ پائے گا اسے کھلی ہوئی۔''

ان الفاظ سے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ انسانی جسم کے اندر ہی کوئی ایسا سسٹم لگا دیا گیا ہے جس میں اس کے تمام اعمال و افعال ریکارڈ ہو رہے ہیں اور قیامت کے دن ایک chip کی شکل میں اسے اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔اس chip کے اندر اس کی زندگی کی ساری فلم موجود ہو گی' ایک ایک حرکت جو اُس نے کی ہو گی' ایک ایک لفظ جو اس نے منہ سے نکالا ہو گا' ایک ایک خیال جو اس کے ذہن میں پیدا ہوا ہو گا' ایک ایک نیت جو اس کے دل میں پروان چڑھی ہو گی' سب ڈیٹا پوری تفصیل کے ساتھ اس میں محفوظ ہو گا۔روز قیامت اس chip کو کھول کر کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور کہا جائے گا:

آیت ۱۴ ﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝۱۴﴾ ''پڑھ لو اپنا اعمال نامہ! آج تم خود ہی اپنا حساب کر لینے کے لیے کافی ہو۔''

تمہاری زندگی کی کتاب کا ایک ایک ورق اس قدر تفصیل سے تمہارے سامنے موجود ہے کہ تم خود ہی اپنا حساب کر سکتے ہو۔تمہارا سارا debit/credit تمہارے سامنے ہے۔

آیت ۱۵ ﴿مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ﴾ ''جس کسی نے ہدایت کی راہ اختیار کی تو اُس نے اپنے ہی (بھلے کے) لیے ہدایت کی راہ اختیار کی' اور جو کوئی گمراہ ہوا تو اُس کی گمراہی کا وبال اُسی پر ہے۔''

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ﴾ ''اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی۔''

روزِ قیامت ہر کسی کو اپنی بداعمالیوں کا بوجھ ذاتی طور پر خود ہی اٹھانا ہوگا۔ اس سلسلے میں کوئی کسی کی کچھ مدد نہیں کر سکے گا۔ سب اپنے اپنے اعمال کا انبار اپنے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوں گے۔

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝۱۵﴾ ''اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ کسی رسول کو نہ بھیج دیں۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے کہ کسی بھی قوم پر عذابِ استیصال اُس وقت تک نہیں بھیجا گیا جب تک کہ اس قوم کی ہدایت کے لیے اور حق و باطل کا فرق واضح کر دینے کے لیے کوئی رسولؑ مبعوث نہیں کر دیا گیا۔ البتہ چھوٹے چھوٹے عذاب اس قانون سے مشروط نہیں۔ قرآن میں قومِ نوحؑ، قومِ ہودؑ، قومِ صالحؑ وغیرہ کی مثالیں بار بار بیان کی گئی ہیں جن سے اس اصول کی واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ کسی قوم کو عذاب کے ذریعے اس وقت تک مکمل طور پر تباہ و برباد نہیں کیا جاتا جب تک اللہ کا مبعوث کردہ رسولؑ اس قوم کے لیے حق کا حق ہونا بالکل واضح نہ کر دے اور اس سلسلے میں اُس قوم پر اِتمامِ حجت نہ ہو جائے۔ یہی مضمون سورۃ النساء' آیت ۱۶۵ میں اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ﴾ ''(اُس نے بھیجے) رسولؑ خوشخبری دینے والے اور خبردار کرنے والے تاکہ نہ رہے لوگوں کے لیے اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت رسولوں کے بعد۔''

آیت ۱۶ ﴿وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا﴾ ''اور جب ہم ارادہ کرتے کہ تباہ کر دیں کسی بستی کو تو ہم اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے اور وہ اس میں خوب نافرمانیاں کرتے''

﴿فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝۱۶﴾ ''پس ثابت ہو جاتی اس پر (عذاب کی) بات' پھر ہم اس کو بالکل نیست و نابود کر دیتے۔''

یہاں کسی بستی پر عذابِ استیصال کے نازل ہونے کا ایک اصول بتایا جا رہا ہے کہ کسی بھی معاشرے میں اس کا سبب وہاں کے دولت مند اور خوشحال لوگ بنتے ہیں۔ یہ لوگ علی الاعلان اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانیاں کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی دیدہ دلیری کے سبب ان کی رسی مزید دراز کی جاتی ہے' یہاں تک کہ وہ اپنی عیاشیوں اور من مانیوں میں تمام حدیں پھلانگ کر پوری طرح عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں' عوام انہیں ان کے کرتوتوں سے باز رکھنے کے

لیے کوئی کردار ادا نہیں کرتے' بلکہ ایک وقت آتا ہے جب وہ بھی ان کے ساتھ جرائم میں شریک ہو جاتے ہیں اور یوں ایسا معاشرہ اللہ کے عذاب کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ ایسے میں صرف وہی لوگ عذاب سے بچ پاتے ہیں جو نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے رہے ہوں۔

آیت ۱۷ ﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۝۱۷﴾ ''اور کتنی ہی قوموں کو ہم نے ہلاک کیا نوحؑ کے بعد۔ اور کافی ہے آپؐ کا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے اور ان کو دیکھنے کے لیے۔''

آیت ۱۸ ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاۗءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ﴾ ''جو کوئی عاجلہ کا طلب گار بنتا ہے ہم اس کو جلدی دے دیتے ہیں اس میں سے جو کچھ ہم چاہتے ہیں' جس کے لیے چاہتے ہیں''

یہاں پر ''دنیا'' کی بجائے ''عاجلہ'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ دونوں الفاظ مؤنث ہیں۔ ''ادنیٰ'' قریب کی چیز کو کہا جاتا ہے' اس کی مونث ''دنیا'' ہے جبکہ ''عاجل'' کے معنی جلدی والی چیز کے ہیں اور اس کی مؤنث ''عاجلہ'' ہے۔ یہ دنیا نقد کا سودا ہے' یہاں پر راحت بھی فوراً آسودگی دیتی ہے اور اس کی تکلیف بھی فوری طور پر خود کو محسوس کراتی ہے۔ اسی لیے اسے ''عاجلہ'' کہا گیا ہے۔ عاجلہ کے مقابلے میں آیت زیر نظر میں ''آخرت'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کہ قرآن حکیم میں اکثر ''دنیا'' کے مقابلے میں بھی آتا ہے۔ دنیا یا عاجلہ کے مقابلے میں آخرت کو آخرت اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کا ثواب و عذاب بعد میں آنے والی چیز ہے۔

آیت زیر نظر میں جو اصول بیان ہوا ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ جو شخص دنیا کی عیش اور دنیا کی دولت و شہرت حاصل کرنے کا خواہش مند ہو اور صرف اسی کے لیے منصوبہ بندی' محنت اور دوڑ دھوپ کرے' اس کی محنت اور دوڑ دھوپ کو اللہ کسی نہ کسی درجہ میں کامیاب کر دیتا ہے' مگر ضروری نہیں کہ جس قدر کوئی دنیا سمیٹنا چاہے اسی قدر اسے مل بھی جائے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو کوئی بھی اس ''عاجلہ'' کو پانے کی دوڑ میں شامل ہو' کامیاب ٹھہرے' بلکہ ہر کسی کو وہی کچھ ملے گا جو اللہ چاہے گا' اور صرف اسی کو ملے گا جس کے لیے وہ چاہے گا۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حصولِ دنیا کے لیے ساری عمر اپنے آپ کو ہلکان کر دیتے ہیں' مگر دنیا پھر بھی ہاتھ نہیں آتی۔ چنانچہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ جس کو وہ چاہتا ہے اور جس قدر چاہتا ہے دنیا میں اس کی محنت کا صلہ دے دیتا ہے۔

﴿ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿١٨﴾﴾ ''پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لیے جہنم۔ وہ داخل ہوگا اس میں ملامت زدہ' دھتکارا ہوا۔''

اس شخص کی خواہش اور محنت سب دنیا کے لیے کی تھی' چنانچہ دنیا کسی نہ کسی قدر اسے دے دی گئی۔ آخرت کے لیے اس نے خواہش کی تھی اور نہ محنت' لہٰذا آخرت میں سوائے جہنم کے اس کے لیے اور کچھ نہیں ہوگا۔

آیت ۱۹ ﴿وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ ''اور جو کوئی آخرت کا طلب گار ہو' اور اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش کرے اور وہ مؤمن بھی ہو''

یعنی اس کی یہ طلب صرف زبانی دعویٰ تک محدود نہ ہو' بلکہ حصولِ آخرت کے لیے وہ ٹھوس اور حقیقی کوشش بھی کرے' جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے۔ اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اہل ایمان میں سے ہو' کیونکہ ایمان کے بغیر اللہ کے ہاں بڑی سے بڑی نیکی بھی قابل قبول نہیں ہے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿١٩﴾﴾ ''تو یہی لوگ ہوں گے جن کی کوشش کی قدر افزائی کی جائے گی۔''

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! یہ آیت ہم میں سے ہر ایک کے لیے لٹمس ٹیسٹ ہے۔ اس ٹیسٹ کی مدد سے ہر شخص ٹھیک سے معلوم کر سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے کس موڑ پر' کس حیثیت سے کھڑا ہے؟ چنانچہ ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی منصوبہ بندیوں اور شبانہ روز بھاگ دوڑ کی ترجیحات کا تجزیہ کر کے اپنا احتساب کرے کہ وہ کس قدر دنیا کا طالب ہے اور کس حد تک فلاحِ آخرت کو پانے کا خواہش مند؟ بہر حال دنیا پر آخرت کو ترجیح دینا اور پھر اپنے قول و فعل سے اپنی ترجیحات کو ثابت کرنا ایک کٹھن اور دشوار کام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو اس کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

آیت ۲۰ ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ﴾ ''ہم سب کو مدد پہنچائے جا رہے ہیں' ان کو بھی اور ان کو بھی' آپؐ کے رب کی عطا سے۔''

یہ دنیا چونکہ دار الامتحان ہے اس لیے جب تک انسان یہاں موجود ہیں' ان میں سے کوئی مجرم ہو یا اطاعت گزار' ہر ایک کی بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نوازش ہے جس میں سے وہ اپنے نافرمانوں اور دشمنوں کو بھی نواز رہا ہے۔

﴿وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿٢٠﴾﴾ ''اور آپؐ کے رب کی عطا رُکی ہوئی نہیں ہے۔''

دنیا میں اللہ تعالیٰ کی یہ عطا اور بخشش عام ہے۔ اس میں دوست اور دشمن کے امتیاز کی بنیاد پر کوئی قدغن یا روک ٹوک نہیں ہے۔

آیت ۲۱ ﴿اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ﴾ ''دیکھو کیسے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے!''

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بعض لوگوں کو مال و اسباب' ذہنی و جسمانی صلاحیتوں' شکل و صورت اور مقام و مرتبے میں بعض دوسروں پر فضیلت دے رکھی ہے۔ یہ اس کی مرضی اور مشیت کا معاملہ ہے۔

﴿وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿٢١﴾﴾ ''لیکن آخرت کی زندگی درجات اور فضیلت میں اس سے بہت بڑھ کر ہوگی۔''

دنیا میں تو درجات و فضائل جیسے بھی ہوں' جتنے بھی ہوں' محدود ہی ہوں گے' مگر آخرت کی نعمتیں اور نوازشیں ایسی لامحدود اور لامتناہی ہوں گی کہ ان کا موازنہ و مقابلہ دنیا کی کسی چیز سے ممکن ہی نہیں ہوگا۔ یہاں ایک شخص بیس پچیس سال کٹیا میں رہ لے گا اور ایک دوسرا شخص اتنا ہی عرصہ محل میں رہ لے گا تو کیا فرق واقع ہو جائے گا؟ آخر کار تو دونوں کو یہاں سے جانا ہے۔ لیکن آخرت کے آرام و آسائش ابدی ہوں گے۔ وہاں کے نعمتوں کے باغات کی اپنی ہی شان ہوگی: ﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿٨٩﴾﴾ (الواقعة) ''تو (اس کے لیے) آرام اور خوشبودار پھول اور نعمت کے باغ ہیں۔''

آیت ۲۲ ﴿لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿٢٢﴾﴾ ''اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ' کہ پھر بیٹھے رہ جاؤ گے مذموم و بے سہارا ہو کر۔''

آئندہ دو رکوع اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ ان میں تورات کے احکامِ عشرہ (Ten Commandments) کو قرآنی اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نزدیک ان احکام کے اندر تورات کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ ان احکام کا خلاصہ ہم سورۃ الانعام کے آخری حصے میں بھی پڑھ آئے ہیں۔ یہاں پر وہی باتیں ذرا تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔

غُصّہ کی ممانعت

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کا یکم فروری ۲۰۰۸ء کا خطبہ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (آل عمران)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ ' اَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ ﷺ : اَوْصِنِیْ ' قَالَ :

((لَا تَغْضَبْ)) فَرَدَّدَ مِرَارًا' قَالَ :((لَا تَغْضَبْ)) (۱)

سیدنا ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: آپؐ مجھے وصیت فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا:

''غصہ نہ کیا کرو!'' اُس نے بار بار اپنا سوال دہرایا۔ آپ ﷺ نے ہر بار یہی جواب دیا کہ ''غصہ نہ کیا کرو!''

معزز سامعین کرام!

''اربعینِ نَوَوی'' کی حدیث ۱۶ آج ہمارے زیر مطالعہ ہے اور اس حدیث میں شدت اور تکرار کے ساتھ غصہ کی ممانعت کا ذکر ہے۔ اس کے لیے تمہیداً میں نے سورۂ آلِ عمران کی دو آیات تلاوت کی ہیں۔ وہاں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ﴾ ''(اے مسلمانو!) مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت کے حصول کی طرف'' — مسارعت

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب الحذر من الغضب

کے معنی ہیں: تیز دوڑنے کے مقابلہ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا۔ آیت کے اس ٹکڑے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے مسلمانو! اپنے رب کی مغفرت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ ﴿وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ﴾ ''اور (مسابقت کرو) جنت کے حصول کے لیے جس کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین جتنا ہے''۔ ﴿اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝﴾ ''جو تیار کی گئی ہے (اور سجائی گئی ہے) اہل تقویٰ کے لیے۔''

انفاق فی سبیل اللہ: اہلِ تقویٰ کا وصف

اگلی آیت میں اہل تقویٰ کے کچھ اوصاف مذکور ہیں' جن میں پہلا وصف یہ بیان ہوا ہے: ﴿الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ ''وہ لوگ جو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں کشادگی میں بھی اور تنگی میں بھی'' — اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دو جہتیں ہیں: (۱) اللہ کی رضا کے لیے اُس کے بندوں میں سے جو محتاج ہوں اور جن کو کوئی ضرورت لاحق ہو' ان کی مدد کرنا۔ اس مد میں یتیم' بیوائیں' مساکین اور مقروض سب آ جائیں گے۔ (۲) دوسرا یہ کہ اللہ کے دین کے لیے خرچ کرنا۔ مثلاً دین کی تعلیم اور تعلّم کا کوئی نظام بنانا' دین کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے اپنے زمانے میں موجود سارے ذرائع و وسائل کو استعمال کرنا اور ان کے لیے خرچ کرنا' ان سب کا شمار اس دوسری مد میں ہوگا۔

آپ کو معلوم ہے کہ آج کل مختلف ممالک میں اسلامی تعلیمات کو اُجاگر کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے ٹی وی چینلز چل رہے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ لوگوں کی دلچسپی کے لیے انہیں اس میں کچھ چیزیں ایسی بھی شامل کرنی پڑتی ہیں جو لوگوں کی توجہ کا باعث ہوں اور پھر مختلف قسم کے اشتہارات بھی شامل کرنے پڑتے ہیں تاکہ خرچ پورا ہو سکے۔ لیکن اس وقت پوری دنیا میں کم سے کم ایک مکمل ٹی وی چینل ایسا ہے جس کی بنیاد خالصتاً دین پر رکھی گئی ہے اور یہ چینل ''پیس ٹی وی'' ہے جو ڈاکٹر ذاکر نائیک نے شروع کیا اور اس کے ساتھ بہت لوگوں نے تعاون کیا ہے۔ پھر اِس چینل کو چلانے کے لیے انہیں کتنا خرچ پڑا' اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ کروڑوں روپے چاہئیں ہوتے ہیں کسی بھی چینل کو

چلانے کے لیے۔ خاص طور پر ''پیس ٹی وی'' جیسے اسلامی چینل کو چلانا اور بھی مشکل ہے' اس لیے کہ اس میں کوئی قابل اعتراض اشتہار نہیں چلتا' کسی بینک یا کسی انشورنس کمپنی کا اشتہار نہیں چلایا جاتا اور نہ ہی کسی عورت کی تصویر دی جاتی ہے۔ اس چینل پر اشتہار بھی صرف وہی آئے گا جو ہر طرح کے حرام کاروبار سے خالص اور پاک ہو۔ اگر کوئی ایسا اشتہار ہے تو وہ اس چینل پر چلے گا' ورنہ نہیں' جبکہ ابتدا میں تو اُن کے پاس ایسا کوئی اشتہار تھا ہی نہیں۔ بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دو جہتیں ہیں: ایک ہے ضرورت مند لوگوں کی مدد کرنا اور دوسرا ہے دین کی ترویج اور نشر و اشاعت کے لیے کسی طور پر بھی خرچ کرنا۔

آیت کے اس ٹکڑے کے حوالے سے دوسری نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ اس میں فرمایا گیا: ﴿فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ یعنی اہلِ تقویٰ وہ ہیں جو اللہ کی راہ میں خوشحالی اور تنگی دونوں صورتوں میں خرچ کرتے ہیں۔ خوشحالی کے دنوں میں تو آدمی کے پاس کافی مال ہوتا ہے اور ایسی صورتِ حال میں اگر وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر رہا ہے تو اس کی طبیعت پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا' لیکن اگر خود تنگی محسوس کر رہا ہے اور پھر بھی خرچ کر رہا ہے تو یہ گویا اس سے اگلا اور مستحسن قدم ہے۔

اہلِ تقویٰ کا دوسرا وصف: غصہ کو پی جانا اور درگزر کرنا

آگے اہل تقویٰ کا دوسرا وصف یہ بیان ہوا ہے: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ﴾ ''اور وہ لوگ اپنے غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرنے والے ہیں''۔ ظاہر بات ہے کہ کسی شخص کی غلطی اور خطا پر غصہ تو آتا ہے' یا کسی نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے تو آپ کو غصہ آئے گا۔ بہرحال جس صورت میں بھی غصہ آئے تو اپنے غصے کو پی جاؤ اور لوگوں کو معاف کرو۔ اس لیے کہ یہی اہلِ ایمان اور اہلِ تقویٰ کا شیوہ ہے۔ غصہ کو پی جانا اور معاف کر دینا' درحقیقت ایک ہی کام کے دو رخ ہیں۔

آخر میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾﴾ ''اللہ تعالیٰ کو ایسے محسنین بہت پسند ہیں''— یہاں نوٹ کر لیجیے کہ یہ وہی درجہ احسان ہے جو ہم حدیثِ جبریل کے ضمن

میں بڑی تفصیل سے پڑھ چکے ہیں اور بعض دوسری احادیث کے ضمن میں بھی اس پر گفتگو ہوتی رہی ہے اور اگلی حدیث میں' ان شاء اللہ' اس کا ذکر پھر آئے گا— آیت کے اس آخری ٹکڑے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے محسنین بہت پسند ہیں جو اپنے دین کو خوبصورت بنا دیں' ان کا دین اور ان کی دینی زندگی دل کو لبھانے والی اور لوگوں کو پسند آنے والی ہو۔

حدیث کی تشریح

اب ہم حدیث کی طرف آتے ہیں۔ آج ہمارے زیر مطالعہ جو حدیث ہے' اس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اَنَّ رَجُلاً قَالَ لِلنَّبِیِّ ﷺ: اَوْصِنِیْ ''ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے کچھ وصیت فرمائیے!'' اَوْصٰی یُوْصِیْ اِیْصَاءً (بابِ افعال) کے معنی ہیں: ''وصیت کرنا'' جبکہ وَصَّی یُوَصِّی تَوْصِیَۃً (باب تفعیل) کے معنی ہیں: تدریجاً اور مسلسل وصیت کرتے رہنا۔ زیر مطالعہ حدیث میں اَوْصِنِیْ کے الفاظ ہیں' جس کے معنی ہیں کہ مجھے وصیت کیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا تَغْضَبْ)) ''تم غصہ نہ کیا کرو''۔ یعنی تم مغلوب الغضب نہ ہو جایا کرو' بایں طور کہ مبادا غصہ آئے تو تم پر چھا جائے اور تمہارے اوپر اپنا غلبہ کر دے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ فَرَدَّدَ مِرَارًا ''اُس شخص نے بار بار یہی سوال دہرایا''۔ اس شخص کے دل میں شاید کوئی اور بات تھی' تو اُس نے پھر کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے وصیت کیجیے۔ اور پھر وہ بار بار یہی کہتا رہا تو نبی اکرم ﷺ نے ہر بار یہی فرمایا: ((لَا تَغْضَبْ)) ''تم غصہ نہ کیا کرو!''

غصے کے حوالے سے انسان کی تین قسمیں

اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ غصہ آ جانا ایک فطری بات ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے غصہ انسان کی فطرت میں رکھا ہے۔ اس اعتبار سے حضرت حسن بصریؒ کا ایک قول بڑا حکیمانہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ غصے کے حوالے سے انسان تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو پورا اور مکمل انسان ہے' ایک وہ ہے جو آدھا انسان ہے' یعنی جو

انسانیت کے معیار پر مکمل پورا نہیں اترتا' البتہ نصف تک آجاتا ہے۔ جبکہ تیسرا ان دونوں کے برعکس ہے اور وہ ہے: لَیْسَ بِرَجُلٍ یعنی اُس میں انسانیت نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں' بلکہ وہ حیوان ہے۔ پورا انسان تو وہ ہوتا ہے جسے دیر میں غصہ آئے اور جلدی رفع ہو جائے۔ آدھا انسان وہ ہے جسے غصہ جلدی آئے اور جلدی رفع ہو جائے یا دیر میں غصہ آئے اور دیر میں رفع ہو۔ یعنی جلدی غصہ آیا اور جلدی ختم بھی ہو گیا' یا دیر میں غصہ آیا اور جانے میں بھی دیر لگا دی تو یہ دونوں برابر ہیں۔ تیسرا شخص وہ ہے کہ جسے جلدی غصہ آئے اور دیر میں جائے۔ ایسا انسان اخلاقی اعتبار سے انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔ لہٰذا غضب کے اعتبار سے یہ تین درجے ہمارے سامنے ضرور رہنے چاہئیں اور ہمیں مکمل انسان بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالی طبیعت

اس حوالے سے یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مختلف مزاج بنائے ہیں۔ بعض میں جمال اور رحم کا عنصر زیادہ ہوتا ہے' جبکہ بعض لوگ جلالی مزاج کے ہوتے ہیں۔ طبائع اور مزاج کا یہ فرق ہمارے بزرگوں اور دین دار لوگوں میں بھی ہوتا ہے' حتیٰ کہ انبیاء و رسل علیہم السلام میں بھی یہ فرق نمایاں ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام جلالی طبیعت کے آدمی تھے۔ ان کی جلالی طبیعت کو واضح کرنے والے کئی واقعات قرآن حکیم میں مذکور ہیں۔ ایک واقعہ تو بہت معروف ہے کہ ایک قبطی اور ایک اسرائیلی کا کسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں سے گزرے تو اسرائیلی نے آپؑ سے مدد مانگی۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی کو ایک مُکّا رسید کیا اور اس کی جان نکال دی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جلال کا سب سے بڑا نقشہ جو قرآن مجید میں آتا ہے وہ بنی اسرائیل کے شرک میں ملوث ہونے کے موقع پر تھا جب آپ کوہِ طور پر گئے ہوئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ہجرت کی اجازت دی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل آئے' اللہ تعالیٰ نے سمندر کو پھاڑ کر بنی اسرائیل کو پار گزار دیا۔ اس کے بعد وہ مرحلہ آیا کہ انہیں شریعت دی جائے۔ اس لیے کہ یہ اللہ کا قانون ہے کہ ہجرت

کے بعد شریعت آتی ہے' جبکہ ہجرت سے پہلے کا وقت تو ایک کشاکش کے اندر گزرتا ہے۔

یہی قانون ہمیں سیرتِ محمدی ﷺ میں بھی نمایاں نظر آتا ہے' بایں طور کہ آپؐ کے مکّہ کے بارہ سال ایک کشاکش (جسے عام طور پر کشمکش کہہ دیتے ہیں) اور ایک جِدّوجُہد میں گزرے ہیں۔ اس میں مصیبتیں ہیں' تکلیفیں ہیں' ماریں کھائی جا رہی ہیں' وغیرہ وغیرہ' لیکن اس دور میں تفصیلی شریعت نہیں تھی' اس لیے کہ ابھی تفصیلی شریعت دیے جانے کا موقع نہیں تھا۔ سن گیارہ نبوی میں ہجرت سے ایک ڈیڑھ سال پہلے نماز فرض ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اُس وقت تک زکوٰۃ کا بھی کوئی باقاعدہ نظام نہیں تھا کہ اتنے مال میں اتنی زکوٰۃ ہے۔ البتہ لفظ زکوٰۃ اُس دور میں اگر آیا ہے تو وہ عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے کہ اپنے اموال میں سے صدقہ خیرات نکال کر اُسے پاک کرتے رہو۔ الغرض ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے لیے شریعت نازل ہوئی۔ اس شریعت کا ابتدائی خاکہ (بلیو پرنٹ) سورۃ البقرۃ میں تیار ہوا ہے' جبکہ سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ اس کی تکمیل کی سورتیں ہیں۔ [آپ میں سے بہت سے حضرات جانتے ہوں گے کہ کوئی بھی عمارت بنانی ہو تو اس کا جو نقشہ بنتا ہے وہ نیلے کاغذ پر بنتا ہے اور اس کو بلیو پرنٹ (یا ایمونیا پرنٹ) کہا جاتا ہے۔]

بہرحال جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر چالیس دن کے لیے طلب کیا — اس کو ہم چِلّہ بھی کہہ سکتے ہیں' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے چالیس روز کی ریاضت کروائی اور عبادت و ذکرِ الٰہی کرایا — اس کے بعد انہیں اللہ نے تورات عطا فرما دی۔ اس ضمن میں آپ کو یاد آجانا چاہیے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے بھی قرآن مجید کے نزول سے قبل اسی طرح کا معاملہ غارِ حرا میں کیا گیا۔ آپؐ کی وہاں پر جو خلوت گزینی ہوتی تھی اور وہاں پر آپؐ جو بھی عبادات کیا کرتے تھے اس کی تفصیلات تو ہمیں معلوم نہیں ہیں' لیکن یہ ضرور ہے کہ آپؐ نے تخلیہ فرمایا۔ غارِ حرا میں آپ ﷺ کے اس تخلیہ کے حوالے سے عام طور پر محدثین یہ کہتے ہیں: **کان صفة تعبّده فی غار حراء التفکر والاعتبار** کہ غارِ حرا میں آپ ﷺ کی عبادت دراصل غور و فکر پر مشتمل تھی۔ آپؐ غور و فکر

کرتے تھے کہ یہ کائنات کیا ہے‘ اس کا نظام کون چلا رہا ہے‘ ہمارا معاشرہ کدھر جا رہا ہے‘ یہ خرابیاں کیوں بڑھ رہی ہیں‘ انسان انسان کا خون کیوں کرتا ہے؟ یہ کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ بھوکے مر رہے ہیں اور کچھ لوگوں کے پاس بہت دولت جمع ہوگئی ہے۔ الغرض غارِ حرا میں آپؐ کی عبادات کی حقیقت اور تفصیلات اگرچہ ہمیں معلوم نہیں ہیں‘ مگر بہرحال تخلیہ اور غار میں آپ ﷺ کا قیام اپنی جگہ ثابت ہے۔

بنی اسرائیل کا شرکِ جلی (بچھڑے کی پوجا کرنا)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی کوہِ طور پر چالیس دن تخلیہ کا یہ معاملہ ہوا اور پھر انہیں اَلواح دے دی گئیں۔ یہ پتھر کی تختیاں تھیں اور ان کے اوپر احکامِ عشرہ (Ten Commandments) کندہ تھے جو کہ شریعت موسوی کے اساس ہیں۔ پیچھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں سامری کو موقع مل گیا اور اس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایک شعبدہ دکھایا اور آلِ فرعون کے زیورات سے ایک بچھڑا بنا ڈالا — آلِ فرعون اپنے زیورات بنی اسرائیل کے پاس امانتاً رکھا کرتے تھے۔ یعنی انہیں بھی اندازہ تھا کہ یہ اسرائیلی بددیانت اور خائن نہیں ہو سکتے‘ اس لیے کہ یہ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام کی اولاد ہیں۔ اگرچہ ان میں اور خرابیاں آ گئی ہوں گی‘ لیکن آلِ فرعون ان کی امانت داری کے قائل تھے‘ اس لیے وہ ان کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے تھے۔ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو آلِ فرعون کی طرف سے امانتاً رکھوائے گئے سارے زیورات بھی ساتھ لے کر آ گئے۔ سامری نے ان سے کہا کہ یہ سارے زیورات تم پھینک دو‘ اس لیے کہ یہ تو نجس ہیں اور یہ تمہارے لیے جائز نہیں ہیں۔ اس حد تک تو بات ٹھیک ہوئی‘ لیکن سامری نے اُن زیورات کو پگھلا کر ایک بچھڑے کی شکل بنا لی اور اس کے اندر ایسا میکنزم رکھا کہ جب اس میں سے ہوا گزرتی تھی تو اندر سے کھوکھلا ہونے کی وجہ سے اُس میں سے ایسی آواز آتی تھی جیسے بچھڑا ڈکار رہا ہو۔ اُس نے بنی اسرائیل سے کہا کہ یہ ہے تمہارا خدا! جبکہ موسیٰ کو تو کوئی مغالطہ لگا ہے اور وہ کسی غلط فہمی میں پتا نہیں کہاں‘ کس خدا کے پاس گئے ہیں۔ اصل خدا تو یہ ہے‘ لہٰذا تم اس کی پوجا کرو! سامری کی

باتوں میں آ کر بنی اسرائیل کی کثیر تعداد نے اُس بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر آگاہ کر دیا کہ تمہاری قوم فتنے میں پڑ چکی ہے۔

اس ضمن میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے کوہِ طور پر آنے کا اللہ تعالیٰ نے ایک وقت معین کیا تھا‘ لیکن آپؑ فرطِ اشتیاق میں وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جواب طلبی فرمائی۔ اس کی تفصیل سورۂ طٰہٰ میں موجود ہے‘ فرمایا: ﴿وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٨٣﴾﴾ ’’اے موسیٰ! تمہیں کس چیز نے جلدی پر آمادہ کیا اپنی قوم کو چھوڑ کر؟‘‘ یعنی تم اپنی قوم کو چھوڑ کر یہاں آ بھی گئے ہو‘ حالانکہ ابھی تو وقت معیّن نہیں آیا۔ ﴿قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿٨٤﴾﴾ ’’موسیٰ نے (جواب میں) عرض کیا کہ میری قوم میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہے‘ اور پروردگار! میں نے تو تیری طرف (آنے میں اس لیے) جلدی کی تاکہ تو راضی ہو جائے‘‘۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام تو یہ سوچ رہے تھے کہ اللہ ربّ العزت کی طرف سے شاباش ملے گی‘ اس لیے کہ اُن کے پیش نظر تو ع ’’تُو میرا شوق دیکھ‘ مرا اشتیاق دیکھ!‘‘ والی کیفیت تھی لیکن یہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے اور شاباش تو کجا‘ الٹی باز پرس (explanation call) ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جلد بازی کر کے درحقیقت تم نے غلطی کی ہے اور اس کی وجہ سے سامری کو موقع مل گیا اور اس نے تمہاری قوم کو گمراہ کر دیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قوم پر انتہائی غضب ناک ہونا

اللہ تعالیٰ نے جب موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے شرک کی خبر سنائی تو آپؑ انتہائی غصے کے عالَم میں اپنی قوم میں واپس آئے۔ اس کے لیے قرآن میں جو الفاظ آئے ہیں وہ سورۃ الاعراف‘ آیت ۱۵۰ میں مذکور ہیں: ﴿وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا﴾ ’’اور موسیٰؑ اپنی قوم میں نہایت غصے اور افسوس کی حالت میں واپس آئے‘‘ — غَضْبان‘ غضب کی انتہائی شکل ہے اور اس وزن پر عربی زبان میں جو بھی الفاظ آتے ہیں وہ کسی شے کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً اَنَا جَوْعَانُ (میں انتہائی بھوکا ہوں)‘ اَنَا عَطْشَان (میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں)۔ اور رَحْمان وہ ہستی ہے جس میں رحم کا

جذبہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند ہو۔اسی طرح انتہائی غصے کی کیفیت کو ''غضبان'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا تو اس بنا پر یہاں غضبان کا لفظ آیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب معلوم ہوا کہ اُن کی قوم کے کثیر لوگ اس طریقے سے گمراہ اور مشرک ہو گئے ہیں کہ انہوں نے باقاعدہ ایک بچھڑے کو خدا مان لیا ہے اور اس کی پرستش کر رہے ہیں تو ایک طرف تو آپ انتہائی غضب ناک ہوئے اور دوسری طرف آپ نے قوم کی اس حرکت پر انتہائی افسوس اور رنج کا اظہار کیا۔اس کے بعد آپؑ نے جو کیا وہ بھی آپ کی اسی جلالی طبیعت کا مظہر ہے۔اس حوالے سے فرمایا گیا: ﴿وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ؕ﴾ ''اور (شدّتِ غضب سے آپ نے تورات کی) تختیاں (زمین پر) ڈال دیں اور اپنے بھائی ہارون کے سر (کے بال) پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے''۔ بلکہ داڑھی اور پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچا اور کہا کہ تم نے ان کو روکا کیوں نہیں؟ میں تو تمہیں یہاں خلیفہ بنا کر گیا تھا اور تمہارے ہوتے ہوئے یہاں یہ سب کچھ ہو گیا تو تم مجھے بتانے کے لیے میرے پیچھے کیوں نہیں آ گئے؟ انہوں نے کہا کہ مجھے اندیشہ یہ ہوا کہ آپ کہیں گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا' جبکہ میں نے انہیں روکنے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن یہ کہ تفرقہ کے ڈر سے میں نے کوئی بہت بڑا اور انتہائی قدم نہیں اٹھایا۔

مرتد کی سزا: قتل

بنی اسرائیل کے اس شرک کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم نازل ہوا کہ بارہ قبیلوں میں سے ہر قبیلے کے جتنے لوگوں نے یہ شرک کیا ہے' انہیں اسی قبیلے کے وہ لوگ قتل کریں جو توحید پر قائم رہے ہیں۔ چنانچہ تورات کی روایت کے مطابق ستّر ہزار یہودی قتل ہوئے۔ اسی بنا پر اسلام میں بھی مرتد کی سزا قتل ہے' لیکن آج کل کے منکرین حدیث اور روشن خیال دانشور اس سزا کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مغرب سے اپنی روشن خیالی کی سند لینا چاہتے ہیں اور

مغرب کا تصور یہ ہے کہ کسی بھی مذہب کو اختیار کرنے میں انسان کو مکمل آزادی حاصل ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ ایک مسلمان کو اگر عیسائیت پسند آ گئی اور وہ عیسائی ہو گیا تو یہ اُس کا حق ہے اور اس طرح کرنے سے وہ کوئی مجرم نہیں بن جاتا۔ایسے شخص کو قتل کیا جانا انسان کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔اسی طرح اگر کوئی مرد اور عورت رضامندی سے زنا کا ارتکاب کرتے ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟ یہ ان کا حق ہے اور ایسا کرنے سے وہ مجرم نہیں ٹھہرتے۔البتہ اگر کسی نے نابالغ لڑکی سے زنا کیا ہے یا کسی عورت کی زبردستی عصمت دری کی ہے تو اس صورتِ حال میں یہ جرم شمار ہو گا اور ایسا کرنے والا مجرم' لیکن اگر باہمی رضامندی شامل ہے تو پھر کوئی جرم نہیں ہے۔

مغرب میں رائج حقوق انسانی کے مبالغہ آمیز تصور کی رو میں بہہ کر ہمارے ہاں بھی کچھ لوگ قتلِ مرتد اور رجم کے بارے میں مختلف قسم کا پروپیگنڈا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن میں تو قتلِ مرتد اور رجم کی سزا کا کہیں ذکر نہیں ہے' تو پھر تم نے یہ سزائیں کہاں سے نکال لی ہیں؟ اس حوالے سے جان لیجیے کہ حضور اکرم ﷺ نے یہ دونوں سزائیں تورات سے اخذ کر کے اپنی سنت کے ذریعے سے نافذ کی ہیں۔ظاہر بات ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے پہلے تو دنیا میں شریعت موسوی رائج تھی۔ یہودیوں کے لیے شریعت موسوی تھی اور اسی طرح عیسائیوں کے لیے بھی' کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں شریعت (موسوی) کو ختم کرنے آیا ہوں' بلکہ تم پر یہی شریعت لاگو رہے گی۔آپؑ کے بعد سینٹ پال نے آ کر شریعت کو ختم کیا ہے۔اس لحاظ سے آج کی عیسائیت بڑا عجیب مذہب ہے جس میں کوئی قانون ہے ہی نہیں' جبکہ یہودی اپنے تئیں شریعت موسوی پر کاربند ہیں۔ اسلام میں بہرحال قوانین بھی ہیں اور انسانی حقوق کی حدود بھی مقرر ہیں۔لہٰذا اگر آپ مسلمان ہیں اور آپ کو کوئی اور دین پسند آ گیا ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ آپ مسلمان ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔لیکن دارالاسلام میں رہتے ہوئے آپ کو مرتد ہونے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو سزا کے طور پر اُسے قتل کر دیا جائے گا۔

قتلِ مرتد کا سبب

مرتد کی سزا قتل ہے اور اس کا ایک خاص سبب بھی ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی ریاست کی بنیاد نسل' رنگ اور زبان پر نہیں بلکہ نظریے پر ہوتی ہے اور کسی شخص کا یوں مرتد ہو جانا نظریے کو کمزور کر دینے والی شے ہے۔ اس سے تو یہ ہوگا کہ کسی سازش کے تحت بعض لوگ ایک وقت میں ایمان لائیں گے اور پھر مرتد ہو جائیں گے تا کہ اسلام کی ہوا اُکھڑ جائے۔ اس طرح کا معاملہ دورِ نبویؐ میں ہو چکا ہے جس کا ذکر سورۂ آل عمران میں ہے:

﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٧٢﴾﴾

''اور اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ ان اہلِ ایمان پر جو چیز نازل کی گئی ہے اُس پر ایمان لاؤ صبح کے وقت اور اس کا انکار کر دو دن کے آخر میں' شاید (اس تدبیر سے) ان میں سے بھی کچھ پھر جائیں۔''

یعنی وہ ایک دوسرے سے کہتے کہ دیکھو بھئی' اسلام اور ایمان کی بڑی دھاک بیٹھ گئی ہے اور جو شخص ایمان لے آتا ہے وہ اپنے ایمان کو نہیں چھوڑتا' چاہے اسے انگاروں میں ڈال دیا جائے۔ ابوجہل نے حضرت سُمیّہ اور حضرت یاسر ؓ دونوں کو انتہائی بے دردی سے قتل کیا' لیکن انہوں نے کلمۂ کفر زبان سے نکالنا پسند نہیں کیا۔ حالانکہ جان بچانے کے لیے زبان سے کلمہ کفر کہہ دینے کی اجازت ہے جبکہ ایمان دل میں موجود رہے۔ چنانچہ حضرت سمیہؓ اور حضرت یاسرؓ کے بیٹے حضرت عمار ؓ نے جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دیا تھا اور پھر ان کو اس پر شدید پشیمانی ہوئی۔ لیکن حضور ﷺ نے انہیں اطمینان دلایا کہ اس کی بھی اجازت ہے۔ اگرچہ جو مقام تمہارے والدین نے حاصل کیا ہے وہ بہت اونچا مقام ہے۔ وہ عزیمت اپنی جگہ' لیکن یہ رخصت بھی اپنی جگہ دین کا ایک حصہ ہے۔ بہر حال اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے سازش کی اور آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ ایسے کرو کہ ان اہلِ ایمان پر جو چیز نازل کی گئی ہے' اس پر صبح کے وقت ایمان لے آؤ اور دن کے آخر میں اس کا انکار کر دو۔ یعنی تم اہلِ ایمان سے کہو کہ جو کتاب تم پر نازل ہوئی

ہے ہم بھی اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہم بھی مؤمن ہو گئے ہیں۔ اب اس میں یہ اضافے ہیں کہ ذرا حضور ﷺ کے قریب رہو تا کہ لوگ دیکھ لیں کہ دن بھر یہ حضور ﷺ کی صحبت میں رہے ہیں اور پھر شام کو یہ کہتے ہوئے مرتد ہو جاؤ کہ ہم نے سب دیکھ' پرکھ لیا ہے۔ یہ تو دور کے ڈھول سہانے کے مترادف ہے۔ ہم نے اندر جا کر دیکھ لیا ہے' کوئی خاص بات نہیں ہے۔

یہ سب کرنے سے یہ ہوگا: ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٧٢﴾﴾ ''شاید کہ وہ (اسلام سے) برگشتہ ہو جائیں''۔ یعنی اس سے یہ ہوگا کہ کچھ نہ کچھ لوگ ضرور متزلزل ہو جائیں گے۔ آخر سب لوگ تو برابر کے نہیں ہوتے' بلکہ کمزور ایمان والے بھی ہوتے ہیں اور اس طرح کرنے سے کمزور ایمان والوں کے دل کے اندر خدشہ پیدا ہوگا اور شیطان کو وسوسہ اندازی کا موقع مل جائے گا۔ وہ سوچیں گے کہ بڑے بھلے اور اچھے لوگ تھے' بڑی نیک نیتی سے ایمان لائے تھے اور حضور ﷺ کی محفل کے اندر بڑے مؤدب ہو کر بیٹھے رہے تھے' بڑی توجہ سے انہوں نے حضور ﷺ کا کلام سنا تھا تو آخر کوئی بات انہوں نے دیکھی ہوگی نا جس کے سبب یہ لوگ اسلام کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ دراصل اس فتنے کا سدباب کرنے کے لیے قانون بنا ہے کہ جو بھی اسلام لائے' وہ دیکھ بھال کر لائے' اس لیے کہ ایک بار داخل ہونے کے بعد یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تو ایک وادی کے اندر قدم رکھنا ہے جس میں مشکلات بھی آئیں گی' تکالیف بھی آئیں گی' لیکن یہ کہ بہرحال اس سے رجوع کرنے کا پھر حق نہیں ہوگا۔ اگر اسلام کو چھوڑو گے تو قتل کیے جاؤ گے۔ یہ اسلام کا ایک قانون ہے اور اس پر تنقید کرنا شریعت اسلامی کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے۔

کتاب وسُنّت: شریعت کی مستقل بِالذّات بنیادیں

یہ بات میں نے آپ کو اتنی تفصیل سے اس لیے سنائی ہے کہ قتل مرتد اور رجم کی سزائیں قرآن میں مذکور نہیں ہیں' لیکن از روئے قرآن تورات پر بھی لفظ ''قرآن'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ مکہ کے کفار و مشرکین کا ایک قول قرآن مجید میں یوں نقل ہوا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ﴾ (سبا) ''اور کہا

انکار کرنے والوں نے کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اس قرآن پر اور نہ اُس (قرآن) پر جو اس سے پہلے تھا‘‘۔ تو یہاں تورات پر قرآن کے لفظ کا اطلاق ہوا ہے — اور حضور اکرم ﷺ نے یہ دو سزائیں تورات سے لی ہیں۔ یہاں یہ اصول بھی یاد رکھیں کہ شریعت صرف قرآن پر مبنی نہیں ہے‘ بلکہ شریعت کی دو مستحکم اور مستقل بالذات (independent of each other) بنیادیں ہیں اور وہ ہیں: کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ۔ البتہ ہمارے ہاں بعض لوگ ایسے موجود ہیں جو صرف قرآن کو شریعت کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ یہ اہلِ قرآن کہلاتے ہیں‘ لیکن ان کو منکرینِ حدیث کہنا زیادہ مناسب ہے‘ اس لیے کہ یہ حدیث اور سنت کو شریعت کی بنیاد نہیں مانتے۔ پھر یہ لوگ اسلام کی مختلف باتوں کی جو تعبیریں کرتے ہیں‘ ان میں سے کسی ایک بات پر ان میں سے دو آدمی بھی متفق نہیں ہیں۔ مثلاً ان میں سے ہر کوئی صلوٰۃ کے الگ معنی بیان کرتا ہے‘ جبکہ اس سے نماز مراد لینا تو سنتِ رسول اللہ ﷺ سے معین ہوا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ))(۱) ’’نماز پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو‘‘۔ بہرحال شریعت کی دو مستحکم بالذات بنیادیں ہیں اور حدیث وسنت کے بغیر قرآنی احکام کی صحیح تعبیر ممکن نہیں۔

حمیّتِ ذاتی اور حمیّتِ دینی کا فرق

زیرِ مطالعہ حدیث کے ضمن میں‘ میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ انسان کو غصہ تب آتا ہے جب کسی نہ کسی حمیت پر زد پڑتی ہے۔ اب یا تو حمیت ذاتی ہے۔ یعنی آپ نے محسوس کیا کہ میری ذات‘ میری شہرت‘ میری عزت‘ میرے خاندان‘ میری قوم یا میرے وطن پر حملہ کیا گیا ہے‘ تو ظاہر بات ہے‘ آپ کو غصہ آئے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے دین پر حملہ کیا گیا ہے‘ تو یہ حمیتِ دینی ہے‘ اور اس پر غصہ آنا مستثنیٰ ہو جائے گا ان غصوں سے جو حمیتِ ذاتی‘ حمیتِ عائلی‘ حمیتِ قومی یا حمیتِ وطنی پر زد پڑنے کی وجہ سے آتے ہیں۔ لہٰذا اپنے کسی ذاتی معاملے پر غصہ میں آجانا اور اللہ کے

(۱) صحیح الجامع للالبانی‘ ح:۸۹۳۔

دین کے معاملے میں غضب ناک ہو جانا‘ ان میں بنیادی طور پر فرق پڑ جائے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی دینی حمیت پر غصہ آیا تھا کہ میری قوم نے اتنے بڑے بڑے معجزے دیکھنے کے باوجود شرک کی روش اختیار کر لی! — ان معجزوں کے بارے میں سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ﴾ (آیت ۱۰۱) ’’اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ کو نو واضح نشانیاں دیں‘‘۔ شروع میں دو معجزے تھے: (۱) موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بن جانا (۲) یدِ بیضا۔ پھر صحرائے سینا میں منّ وسلویٰ کا نزول ہوا اور ایک چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ اسی طرح بڑے سے بڑے معجزے آتے چلے گئے‘ جبکہ سب سے بڑا معجزہ سمندر کو پھاڑ کر بنی اسرائیل کو فرعون اور اس کے لاؤ لشکر سے نجات دینا تھا — ان سب معجزوں کو دیکھنے کے باوجود قوم کا یوں شرک میں مبتلا ہو جانے پر موسیٰ علیہ السلام کا غضب ناک ہو جانا‘ بالکل معقول اور قرین قیاس ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کی دینی حمیت

دینی حمیت پر غضب ناک ہونے کی ایک اور مثال اللہ کے رسولوں میں حضرت یونس علیہ السلام کی ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الانبیاء‘ آیت ۸۷ میں یہ الفاظ ہیں: ﴿وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا.....﴾ ’’اور مچھلی والے کو بھی (ہم نے نوازا) جب وہ چل دیا غصے سے بھرا ہوا.....‘‘ حضرت یونس علیہ السلام عراق کے شمال میں واقع نینوا شہر میں رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ انہوں نے قوم کو حق کی دعوت وتبلیغ کی اور ہر طرح کی نصیحت وتلقین کا حق ادا کیا‘ مگر قوم ایمان نہیں لائی اور کفر پر اڑی رہی۔ اس کے بعد حضرت یونس علیہ السلام غضب ناک ہو کر اپنی قوم کو چھوڑ کر چل دیے کہ اب تو ان پر اللہ کا عذاب آ کر رہے گا۔ لیکن یہاں ان سے ایک خطا ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تو یہ خطا ہوئی تھی کہ وہ وقت معین سے پہلے کوہِ طور پر پہنچ گئے تھے‘ جبکہ حضرت یونس علیہ السلام سے غلطی یہ ہوئی کہ اللہ کی طرف سے اجازت آجانے سے پہلے ہی آپ اپنی قوم اور شہر کو چھوڑ کر چل دیے‘ حالانکہ رسولوں کے لیے یہ شرط ہے کہ رسول جس قوم یا علاقے کی طرف بھیج دیا جائے تو اللہ کی طرف سے ہجرت کی دوٹوک اجازت (express permission) آجانے سے پہلے رسول وہ جگہ چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔

لیکن حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کے کفر پر اتنے غضب ناک ہو گئے کہ یہ بات ان کے ذہن میں نہ رہی اور آپ اپنی قوم سے ناراض ہو کر غصے کی حالت میں قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔

اس حوالے سے آپ کے ذہن میں آ گیا ہو گا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عام مسلمانوں کے لیے ہجرتِ مدینہ کی اجازت آ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرما دیا کہ تم سب مدینہ چلے جاؤ' لیکن آپؐ خود نہیں گئے' جب تک کہ واضح اور معیّن طور پر آپؐ کے لیے اجازت نہیں آ گئی۔ اس ضمن میں سیرت کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دو اونٹنیاں تیار کی تھیں کہ لمبا سفر ہے اور تیز جانا ہو گا۔ پھر جب ہم جائیں گے تو ظاہر بات ہے کہ ہمارا تعاقب کیا جائے گا' تو آپؓ نے دو اونٹنیوں کو خوب کھلا پلا کر تیار کیا ہوا تھا' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ آپؓ ہجرت کے منتظر تھے' اس لیے بار بار آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے تھے کہ اجازت آ گئی؟ حضور فرماتے کہ ابھی نہیں آئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن ہم نے دیکھا کہ دوپہر کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر کی طرف چلے آ رہے ہیں اور اپنا چہرۂ مبارک اپنے رومال میں چھپایا ہوا ہے۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی' اس لیے کہ عرب میں قیلولے کے وقت یعنی ظہر اور عصر کے درمیان بازار اور دفاتر بھی بند ہو جاتے ہیں اور اُس وقت کسی کے گھر آنا جانا بھی نہیں ہوتا' الّا یہ کہ آپ کو کسی نے دوپہر کے کھانے پر بلایا ہو۔ خیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آ کر کہا کہ ابوبکر! اجازت آ گئی ہے۔ اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ دل میں سوچتے ہوئے کہ مجھے شاباش ملے گی' عرض کیا: حضور! میں نے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی ہیں اور انہیں خوب کھلا پلا کر فربہ کیا ہے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑا سا توقف کرنے کے بعد فرمایا: اچھا ٹھیک ہے' میں ایک اونٹنی استعمال کروں گا لیکن میں اس کی قیمت ادا کروں گا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے اور کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ سے بھی مغائرت ہے؟ میں نے تو اپنے جان و مال میں سے کوئی بھی چیز آپ سے بچا کر نہیں رکھی ہے۔

بہرحال جب تک فیصلہ کُن اجازت نہیں آ جاتی اُس وقت تک رسول اپنی قوم کو

چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ حضرت یونس علیہ السلام سے غلطی ہوئی کہ وہ انتہائی غصے کی حالت میں بغیر اجازت کے قوم کو چھوڑ کر چل دیے۔ اس غلطی پر ان کی پکڑ ہوئی' اس لیے کہ کارِ رسالت کی شرائط میں سے ایک شرط کے اندر کچھ کمی ہوئی ہے۔ لہٰذا آپ کو معلوم ہے کہ پھر مچھلی نے آپؑ کو نگل لیا اور مچھلی کے پیٹ میں آپؑ نے: "لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ" (الانبیاء:۸۷) کا ورد کیا' اللہ سے استغفار کیا۔ اس پر اللہ رب العزت نے انہیں معاف فرمایا — وہیل مچھلی نے آپ کو ''شطّ العرب'' میں نگلا تھا (دریائے فرات اور دریائے دجلہ عراق کے جنوب میں باہم مل کر ایک چھوٹے سے سمندر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں' جو شطّ العرب کہلاتا ہے) اور خلیج فارس سے ہوتے ہوئے کہیں مکران کے ساحل پر اللہ کے حکم سے اُگلا تھا۔ اس پر جناب احمد الدین مارہروی کا ایک تحقیقی مضمون ماہنامہ میثاق اور حکمت قرآن میں شائع ہوا تھا۔ ☆

اس ساری تفصیل بتانے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کا غضب ناک ہو جانا اگرچہ حمیت دینی کی وجہ سے تھا' لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ شرائط کو نظر انداز کرنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ اس ضمن میں اگر کسی رسول سے بھی کوتاہی ہوئی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوئی ہے۔

''مجھے یونسؑ بن متّیٰ پر فضیلت مت دو!''

یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ ہمارے ہاں نعتوں کے اندر شدید مبالغہ آرائی کی جاتی ہے اور آج کل تو اس بارے میں انتہا ہو گئی ہے' جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ اَنْ يَّقُوْلَ اَنَا خَيْرٌ مِنْ يُّوْنُسَ ابْنُ مَتّٰى)) (۱)

کسی شخص کے لیے مناسب نہیں کہ وہ یہ کہے کہ میں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) یونس بن متّیٰ سے بہتر ہوں۔''

دیکھئے حضرت یونس علیہ السلام واحد رسول ہیں جن سے کچھ خطا ہوئی تو پھر اس خطا کی انہیں سزا

☆ مذکورہ مضمون ''شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ'' کے عنوان سے اول ماہنامہ میثاق' فروری ۱۹۸۰ء' بعد ازاں حکمت قرآن کے شمارہ فروری ۱۹۹۹ء اور پھر مئی ۲۰۰۶ء میں مکرر شائع ہوا تھا۔ (مرتب)

(۱) صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب قوله انا اوحینا الیك.....

بھی ملی۔ باقی اور رسولوں میں سے کسی کے ساتھ ایسا معاملہ ثابت نہیں ہے۔ خطا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ہوئی تھی‘ جس کے بارے میں ہم قبل ازیں پڑھ چکے ہیں‘ لیکن اس خطا کی کوئی سزا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں ملی۔ لہٰذا حضرت یونس علیہ السلام وہ واحد رسول ہیں جنہیں خطا کی سزا ملی ہے اور پھر اس کا فائدہ بھی قومِ یونس کو پہنچا ہے۔ آج کی جدید اکاؤنٹنگ کا اصول ہے کہ ہر ڈیبٹ (debit) کے مقابلے میں کوئی کریڈٹ (credit) اور ہر کریڈٹ کے مقابلے میں کوئی ڈیبٹ ہوگا۔ اس حساب سے یہ جو ڈیبٹ ہوا حضرت یونس علیہ السلام کے خلاف‘ تو یہ قوم کے حق میں کریڈٹ بن گیا۔ وہ اس طرح کہ حضرت یونس علیہ السلام کے جانے کے بعد عذاب کے آثار شروع ہو گئے تھے‘ جس کے بعد کسی بھی قوم کی اجتماعی توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے‘ جس طرح کسی فرد کے لیے موت کے آثار نظر آنے پر توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے — جب عذاب کے آثار شروع ہو گئے تو قوم کو یاد آیا کہ یہ تو وہی بات ہو گئی جو یونس کہا کرتے تھے۔ اس پر وہ فوراً گھروں سے نکل کر کھلے میدان میں جمع ہو گئے اور چیخ چیخ کر‘ رو رو کر‘ گڑگڑا کر اللہ سے معافیاں مانگنے لگے اور دعائیں کرنے لگے‘ تو اللہ نے ان پر سے عذاب ٹال دیا۔

سورۂ یونس میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ﴾ یہاں ”بعد ظھور العذاب“ کے الفاظ محذوف ہیں۔ اس کا ترجمہ اس طرح ہوگا: ”کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی (عذاب کے ظاہر ہونے کے بعد) ایمان لائی ہو اور اس کے ایمان نے اس کو فائدہ دیا ہو سوائے یونس کی قوم کے!“ ﴿لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝۹۸﴾ ”جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان پر دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ہٹا دیا اور ان کو ایک خاص مدت کے لیے مہلت دے دی“۔ عذاب کے آثار ظاہر ہونے کے بعد ایمان لانا اللہ کو قبول نہیں ہے‘ لیکن اس میں استثناء ہے قومِ یونس کا۔ ان پر عذاب کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے‘ لیکن انہوں نے اجتماعی توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا‘ عذاب کو ٹال دیا اور ان کو کچھ مہلت دے دی۔

روحانی معالج کے لیے شخصی تشخیص کی اہمیت

اس حدیث کے حوالے سے آخری نکتہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اس اندازِ بیان — ((لَا تَغْضَبْ، لَا تَغْضَبْ، لَا تَغْضَبْ)) — سے ایک بڑی اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ درحقیقت شخصی تشخیص اور شخصی علاج تھا۔ روحانی معالج کے لیے شخصی تشخیص بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے اور وہ اسی کے مطابق علاج کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ انبیاء و رسل علیہم السلام مزکّی تھے‘ اور وہ لوگوں کا روحانی تزکیہ کرتے تھے۔ اسی طرح ہمارے ہاں صوفیاء کا ایک طبقہ ہے جنہوں نے اپنے مشائخ سے تزکیہ کرایا ہوتا ہے اور پھر وہ دوسروں کا تزکیہ کرتے ہیں۔ یہ ایک سلسلہ ہے جو چل رہا ہے۔ اس تزکیہ کے اندر ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ہی بات سب کو بتائی جائے‘ بلکہ مزاج اور طبائع کے لحاظ سے ہر ایک کا تزکیہ کیا جاتا ہے۔ یہی رسول اللہ ﷺ کا انداز تھا۔ اکثر اذکار تو ایسے ہیں جو حضور اکرم ﷺ نے سب کو بتائے‘ مثلاً ہر نماز کے بعد اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ پڑھنا وغیرہ۔ لیکن بعض اذکار ایسے بھی ہیں جو آپ نے کسی فردِ واحد کو اُس کی باطنی کیفیت کے مطابق بتلائے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے بعض لوگوں کو کچھ خاص نصیحتیں فرمائیں۔ چنانچہ روحانی معالج کے اندر شخصی تشخیص و شخصی علاج کی صلاحیت ضروری ہے اس لیے کہ لوگوں میں مختلف قسم کے باطنی امراض ہوتے ہیں۔ کسی کے اندر دولت کی محبت زیادہ ہے‘ کسی کے اندر غصہ بہت تیز ہے اور کسی کے اوپر شہوت کا غلبہ بہت زیادہ ہوتا ہے‘ تو اب سب کا علاج ایک طرح نہیں ہوگا‘ بلکہ ہر ایک کا علاج اسی کے اعتبار سے ہو گا۔ لہٰذا زیر مطالعہ فرمانِ نبویؐ میں یہ اُس شخص کے لیے شخصی تشخیص و علاج (personal prescription) ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے اندر غضب اور غصہ کا معاملہ ضرورت سے زائد تھا‘ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے تکرار کے ساتھ اسے اِسی سے بچنے کا مشورہ دیا اور بتکرار اسی کی وصیت فرمائی۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات

(مرتب: حافظ محمد زاہد‘ ادارتی معاون)

حجابِ شرعی کے درجات

اور اُن کے احکام کی تفصیل

مفتی محمد شفیعؒ

پردۂ نسواں کے متعلق قرآن مجید کی سات آیات اور حدیث کی ستّر (۷۰) روایات کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مطلوبِ شرعی حجابِ اَشخاص ہے، یعنی عورتوں کا وجود اور ان کی نقل وحرکت مَردوں کی نظروں سے مستور ہو، جو گھروں کی چار دیواری یا خیموں اور معلق پردوں کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ اس کے سوا جتنی صورتیں حجاب کی منقول ہیں وہ سب ضرورت کی بنا پر اور وقتِ ضرورت اور قدرِ ضرورت کے ساتھ مقید اور مشروط ہیں۔

اس طرح پردہ کا پہلا درجہ جو اصل مطلوبِ شرعی ہے وہ حجابِ اشخاص ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں رہیں۔ لیکن شریعتِ اسلامیہ ایک جامع اور مکمل نظام ہے جس میں انسان کی تمام ضروریات کی رعایت پوری کی گئی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ عورتوں کو ایسی ضرورتیں پیش آنا ناگزیر ہے کہ وہ کسی وقت گھروں سے نکلیں۔ اس کے لیے پردہ کا دوسرا درجہ قرآن وسنت کی رو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سر سے پاؤں تک برقع یا لمبی چادر میں پورے بدن کو چھپا کر نکلیں۔ راستہ دیکھنے کے لیے چادر میں سے صرف ایک آنکھ کھولیں، یا برقع میں جو جالی آنکھوں کے سامنے استعمال کی جاتی ہے وہ لگالیں۔ ضرورت کے مواقع میں پردہ کا دوسرا درجہ بھی پہلے کی طرح سب علماء وفقہاء کے درمیان متفق علیہ ہے۔

ایک تیسرا درجہ بھی بعض روایات سے مفہوم ہوتا ہے، جس میں صحابہ وتابعین اور فقہاء امت کی راہیں مختلف ہیں۔ وہ یہ کہ عورتیں جب بضرورت گھروں سے باہر نکلیں تو وہ اپنا چہرہ اور ہتھیلیاں بھی لوگوں کے سامنے کھول سکتی ہیں بشرطیکہ سارا بدن مستور ہو۔

پردۂ شرعی کے ان تینوں درجوں کی تفصیل یہ ہے:

پہلا درجہ حجابِ اشخاص بالبیوت

قرآن وسنت کی رو سے اصل مطلوب یہی درجہ ہے، سورۃ الاحزاب کی زیر بحث آیت

﴿وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ط﴾ (آیت ۵۳) اِس کی واضح دلیل اور اس سے زیادہ واضح سورۃ الاحزاب ہی کی آیت ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ (آیت ۳۳) ہے۔ ان آیتوں پر جس طرح رسول اللہ ﷺ نے عمل فرمایا، اس سے اور زیادہ اِس کی تشریح سامنے آجاتی ہے۔

یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ پردۂ نسواں کے متعلق پہلی آیت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے وقت نازل ہوئی۔ روایاتِ حدیث میں حضرت اَنس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس واقعۂ حجاب کو اور سب سے زیادہ اس لیے جانتا ہوں کہ میں اُس وقت حضور ﷺ کی خدمت میں موجود تھا جب پردہ کے لیے یہ آیت نازل ہوئی، تو آپ نے مَردوں کے سامنے ایک چادر وغیرہ کا پردہ ڈال کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اندر مستور کر دیا۔ یہ نہیں کیا کہ ان کو برقع یا چادر میں مستور کر دیتے۔

صحیح بخاری، باب غزوۂ مُوتہ میں حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو حضرت زید بن حارثہ اور جعفر اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی خبر ملی تو آپ ﷺ مسجد نبوی میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر سخت غم وصدمہ کے آثار تھے۔ میں حجرہ کے اندر دروازہ کی ایک شق سے یہ سب ماجرا دیکھ رہی تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اُمّ المومنینؓ اس حادثہ کے وقت بھی باہر آکر برقع کے ساتھ مجمع میں شامل نہیں ہوئیں بلکہ دروازہ کی شق سے اس جلسہ کا مشاہدہ کیا۔

اور صحیح بخاری کتاب المغازی عمرۃ القضا کے باب میں ہے کہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مسجد نبوی میں حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے باہر متصل تشریف رکھتے تھے، اور رسول اللہ ﷺ کے عمروں کے متعلق باہم گفتگو کر رہے تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ اسی درمیان میں ہم نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی مسواک کرنے اور حلق صاف کرنے کی آواز حجرہ کے اندر سے سنی۔ اِس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آیاتِ حجاب نازل ہونے کے بعد ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا معمول یہ ہو گیا تھا کہ گھروں میں رہ کر پردہ کرتی تھیں۔

اسی طرح صحیح بخاری میں باب غزوۃ الطائف میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک پانی کے برتن میں کلی کر کے حضرت ابوموسیٰ اور بلال رضی اللہ عنہما کو عطا فرمایا کہ اس کو پی لیں، اور اپنے چہرے پر مل لیں۔ اُمّ المومنین حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا پردہ کے پیچھے یہ واقعہ دیکھ رہی تھیں، انہوں نے اندر سے آواز دے کر ان دونوں بزرگوں سے کہا کہ اس تبرّک میں سے کچھ اپنی ماں یعنی اُمّ

سلمہؓ کے لیے چھوڑ دینا۔ یہ حدیث بھی شاہد ہے کہ نزولِ حجاب کے بعد ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن گھروں اور پردوں کے اندر رہتی تھیں۔

فائدہ

اس روایت میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن بھی رسول اللہ ﷺ کے تبرکات کی ایسی ہی شائق تھیں جیسے دوسرے مسلمان۔ یہ بھی آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس ہی کی خصوصیت تھی، ورنہ بیوی سے جو بے تکلف تعلق شوہر کا ہوتا ہے، اس کے ساتھ اس کے تقدس و تعظیم کا یہ درجہ قائم رہنا عادتاً ناممکن ہے۔

اور صحیح بخاری کتاب الادب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ اونٹ پر سوار تھے۔ آپ ﷺ کے ساتھ اُمّ المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بھی سوار تھیں۔ راستہ میں اچانک اونٹ کے ٹھوکر لگی، اور ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے بیان کے مطابق آپ ﷺ اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اونٹ سے گر گئے۔ تو ابوطلحہؓ آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ مجھے آپ ﷺ پر قربان کر دے، آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، تم عورت کی خبر لو! ابوطلحہؓ نے پہلے تو اپنا چہرہ کپڑے میں چھپایا، پھر حضرت صفیہؓ کے پاس پہنچے اور ان کے اوپر کپڑا ڈال دیا تو وہ کھڑی ہو گئیں۔ پھر اسی طرح پردہ میں مستور اُن کو ان کی سواری پر سوار کیا۔ اس واقعہ میں بھی، جو ایک حادثہ کی صورت میں اچانک پیش آیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا پردہ کے معاملہ میں اتنا اہتمام اس کی بڑی اہمیت کا شاہد ہے۔

جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا خَرَجَتِ الْمَرْأَةُ اسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ)) (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث، حسن صحیح غریب)

معنی یہ ہیں کہ عورت جب گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاک لیتا ہے، یعنی اس کو مسلمانوں میں برائی پھیلانے کا ذریعہ بناتا ہے۔ اور ابن خزیمہ و ابن حبان نے اس حدیث میں یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں: ((وَاَقْرَبُ مَا تَكُوْنُ مِنْ وَجْهِ رَبِّهَا وَهِيَ فِيْ قَعْرِ بَيْتِهَا)) یعنی عورت اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اُس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے گھر کے بیچ میں مستور ہو۔ اس حدیث میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ اصل عورتوں کے لیے یہی ہے کہ وہ اپنے

گھروں میں بیٹھیں، باہر نہ نکلیں (ضرورت کے مواقع مستثنیٰ ہیں)۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((لَيْسَ لِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ فِي الْخُرُوْجِ اِلَّا مُضْطَرّ)) (رواہ الطبرانی کذا فی الکنز، ص ٦، ج)

یعنی عورتوں کا باہر نکلنے کے لیے کوئی حصہ نہیں، بجز اس کے کہ باہر نکلنے کے لیے کوئی اضطراری ضرورت پیش آ جائے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ میں ایک روز آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا، آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سوال فرمایا: ((أَيُّ شَيْءٍ خَيْرٌ لِلْمَرْأَةِ؟)) ''عورت کے لیے کیا چیز بہتر ہے؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاموش رہے، کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر جب میں گھر میں گیا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا سے میں نے یہی سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: لَا يَرَيْنَ الرِّجَالَ وَلَا يَرَوْنَهُنَّ ''یعنی عورتوں کے لیے بہتر یہ ہے کہ نہ وہ مردوں کو دیکھیں اور نہ مرد اُن کو دیکھیں۔ میں نے ان کا یہ جواب آنحضرت ﷺ کے سامنے نقل کیا، تو آپؐ نے فرمایا: ((صَدَقَتْ اِنَّهَا بِضْعٌ مِنِّيْ)) ''انہوں نے درست کہا، بے شک وہ میرا ایک جزء ہیں۔''

واقعہ افک میں جو سبب حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے جنگل میں رہ جانے کا پیش آیا وہ یہی تھا کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا پردہ صرف برقع چادر ہی کا نہیں تھا بلکہ وہ سفر میں بھی اپنے ہودج میں رہتی تھیں۔ یہ ہودج ہی اونٹ کے اوپر سوار کر دیا جاتا تھا اور اسی طرح اتارا جاتا تھا۔ ہودج مسافر کا مثل مکان کے ہوتا ہے۔ اس واقعہ میں جب قافلہ چلنے لگا تو حسب عادت خادموں نے ہودج کو یہ سمجھ کر اونٹ پر سوار کر دیا کہ اُمّ المومنینؓ اس کے اندر موجود ہیں، اور واقعہ یہ تھا کہ وہ اس میں نہیں تھیں، بلکہ طبعی ضرورت کے لیے باہر گئی ہوئی تھیں۔ اس مغالطہ میں قافلہ روانہ ہو گیا اور اُمّ المومنینؓ جنگل میں تنہا رہ گئیں۔ یہ واقعہ بھی اس بات کا قوی شاہد ہے کہ حجابِ شرعی کا مفہوم رسول اللہ ﷺ اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے یہی سمجھا تھا کہ عورتیں اپنے مکانوں میں، سفر میں ہوں تو اپنی ہودج میں رہیں، اُن کا وجود مردوں کے سامنے نہ آئے۔ اور جب سفر کی حالت میں احجابِ اشخاص کا یہ اہتمام تھا تو حضر میں کتنا اہتمام ہوگا؟

دوسرا درجہ حجاب بالبرقع

ضرورت کے مواقع میں جب عورت کو گھر سے باہر جانا پڑے تو اس وقت کسی برقع یا لمبی

چادر کو سر سے پیر تک اوڑھ کر نکلنے کا حکم ہے' جس میں بدن کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو۔ یہ سورۃ الاحزاب کی اس آیت سے ثابت ہے جو آگے آ رہی ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ﴾ (آیت ۵۹) یعنی اے نبی ﷺ! آپ اپنی ازواجِ مطہرات اور بناتِ طاہرات رضی اللہ عنہن کو اور عام مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیں کہ اپنی جلباب استعمال کریں۔ جلباب اس لمبی چادر کو کہتے ہیں جس میں عورت سر سے پیر تک مستور ہو جائے (روی ذٰلك عن ابن عباس)۔ ابن جریرؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے استعمالِ جلباب کی صورت یہ نقل کی ہے کہ عورت سر سے پاؤں تک اس میں لپٹی ہوئی ہو اور چہرہ اور ناک بھی اس سے مستور ہو' صرف ایک آنکھ راستہ دیکھنے کے لیے کھلی ہو۔ اس آیت کی پوری تفسیر آگے آتی ہے۔ یہاں صرف یہ بتلانا منظور ہے کہ ضرورت کے وقت جب عورت گھر سے نکلنے پر مجبور ہو تو اس کو پردہ کا یہ درجہ اختیار کرنا ضروری ہے کہ جلباب وغیرہ میں سر سے پاؤں تک مستور ہو اور چہرہ بھی بجز ایک آنکھ کے چھپا ہوا ہو۔

یہ صورت بھی باتفاقِ فقہاءِ اُمت ضرورت کے وقت جائز ہے' مگر احادیثِ صحیحہ میں اس صورت کے اختیار کرنے پر بھی چند پابندیاں عائد کی ہیں کہ خوشبو نہ لگائے ہوئے ہو' بجنے والا کوئی زیور نہ پہنا ہو' راستہ کے کنارے پر چلے' مَردوں کے ہجوم میں داخل نہ ہو' وغیرہ۔

تیسرا درجہ پردہ شرعی کا جس میں فقہاء کا اختلاف ہے

یہ ہے کہ سر سے پیر تک سارا بدن مستور ہو' مگر چہرہ اور ہتھیلیاں کھلی ہوں۔ جن حضرات نے 'اِلَّا مَا ظَهَرَ' کی تفسیر چہرے اور ہتھیلیوں سے کی ہے' ان کے نزدیک چونکہ چہرہ اور ہتھیلیاں حجاب سے مستثنیٰ ہو گئیں' اس لیے ان کو کھلا رکھنا جائز ہو گیا۔ (کماروی عن ابن عباسؓ) اور جن حضرات نے 'مَا ظَهَرَ' سے برقع' جلباب وغیرہ مراد لی ہے وہ اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ (کماروی عن ابن مسعودؓ)۔ جنہوں نے جائز کہا ہے اُن کے نزدیک بھی یہ شرط ہے کہ فتنہ کا خطرہ نہ ہو۔ مگر چونکہ عورت کی زینت کا سارا مرکز اُس کا چہرہ ہے' اس لیے اس کو کھولنے میں فتنہ کا خطرہ نہ ہونا شاذ و نادر ہے۔ اس لیے انجامِ کار عام حالات میں ان کے نزدیک بھی چہرہ وغیرہ کھولنا جائز نہیں۔

ائمہ اربعہ میں سے امام مالک' شافعی' احمد بن حنبل رحمہم اللہ تین اماموں نے تو پہلا مذہب اختیار کر کے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی مطلقاً اجازت نہیں دی' خواہ فتنہ کا خوف ہو یا نہ ہو۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ دوسرا مسلک اختیار فرمایا' مگر خوفِ فتنہ کا نہ ہونا شرط قرار دیا' اور چونکہ عادتاً یہ شرط مفقود ہے اس لیے فقہاءِ حنفیہ نے بھی غیر محرموں کے سامنے چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنے کی اجازت نہیں دی۔

مذاہب ائمہ اربعہ کی روایتیں ان مذاہب کی مستند کتابوں کے حوالہ سے رسالہ 'تفصیل الخطاب جزا احکام القرآن' میں مفصل بیان کر دی گئی ہیں۔ حنفیہ کا اصل مذہب چونکہ چہرے اور ہتھیلیوں کا حجاب سے مستثنیٰ ہونے کا ہے اس لیے اس جگہ مذہب حنفیہ کی چند روایات نقل کی جاتی ہیں' جن میں بوجہ خوفِ فتنہ ممانعت کرنے کا حکم مذکور ہے۔

سمجھ لو کہ کسی عضو کے ستر میں داخل نہ ہونے اور اس کی طرف نظر کے جائز ہونے میں کوئی تلازم نہیں' کیونکہ نظر کا جواز تو اس پر موقوف ہے کہ شہوت کا خطرہ نہ ہو حالانکہ وہ عضو ستر میں داخل نہیں۔ اسی وجہ سے اجنبی عورت کے چہرے یا کسی بے ریش لڑکے کے چہرے کی طرف نظر کرنا حرام ہے جب کہ شہوت پیدا ہونے میں شک ہو' حالانکہ چہرہ ستر میں داخل نہیں۔

'فتح القدیر' کی مذکورہ عبارت سے خطرۂ شہوت کی یہ تفسیر بھی معلوم ہو گئی کہ اگرچہ بالفعل کوئی شہوانی نیت نہ ہو مگر ایسا خیال پیدا ہو جانے کا شک ہو۔ جب ایسا شک ہو تو نہ صرف اجنبی عورتوں کے بلکہ بے ریش لڑکوں کے چہرے کو دیکھنا بھی حرام ہے۔ اور خیالِ شہوت پیدا ہونے کی تشریح 'جامع الرموز' میں یہ کی گئی ہے کہ نفس میں اس کے قریب ہونے کا میلان پیدا ہو جائے' اور یہ ظاہر ہے کہ نفس میں اتنا میلان بھی پیدا نہ ہو' یہ چیز تو سلف کے زمانے میں بھی شاذ تھی۔ حدیث میں حضرت فضل رضی اللہ عنہ کو ایک عورت کی طرف دیکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کا اُن کے چہرے کو اپنے ہاتھ سے دوسری طرف پھیر دینا اس کی واضح دلیل ہے' تو اس زمانۂ فساد میں کون کہہ سکتا ہے کہ اس خطرے سے خالی ہے؟ اور شمس الائمہ سرخسیؒ نے اس مسئلہ پر مفصل بحث کے بعد لکھا ہے:

> ''یہ چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف نظر کا جائز ہونا صرف اس صورت میں ہے جبکہ یہ نظر شہوت سے نہ ہو' اور اگر دیکھنے والا جانتا ہے کہ چہرہ دیکھنے سے برے خیالات پیدا ہو سکتے ہیں تو اس کو عورت کی کسی چیز کی طرف بھی نظر کرنا حلال نہیں۔''

اور علامہ شامیؒ نے ردّالمُحتار (کتاب الکراھیة) میں فرمایا ہے:

> ''اگر شہوت کا خطرہ یا شک ہو تو عورت کے چہرے کی طرف نظر ممنوع ہو گی' کیونکہ نظر کا حلال ہونا شہوت نہ ہونے کے ساتھ مشروط ہے اور جب یہ شرط نہ ہو تو حرام ہے۔ اور

یہ بات سلف کے زمانے میں تھی' لیکن ہمارے زمانے میں تو مطلقاً عورت کی طرف نظر ممنوع ہے' مگر یہ کہ کسی حاجت شرعیہ کی وجہ سے نظر کرنا پڑے' جیسے قاضی یا شاہد جن کو کسی معاملہ میں اس عورت کے متعلق شہادت یا فیصلہ دینا پڑے' اور شروطِ صلو میں فرمایا کہ جوان عورت کو (اجنبی) مردوں کے سامنے چہرہ کھولنا ممنوع ہے' نہ اس لیے کہ یہ عورت ہے بلکہ فتنہ کے خوف سے۔''

خلاصہ اس بحث واختلافِ فقہاء کا یہ ہے کہ امام شافعی' مالک' احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے نوجوان عورت کی طرف نظر کرنے کو عادتِ عامہ کی بنا پر سببِ فتنہ قرار دے کر اس سے مطلقاً منع کر دیا' خواہ واقع میں فتنہ ہو یا نہ ہو' جیسے شریعت کے بہت سے احکام میں اس کی نظائر موجود ہیں۔ مثلاً سفر چونکہ عادتاً مشقت ومحنت کا سبب ہوتا ہے' اس لیے خود سفر ہی کو مشقت کا حکم دے کر تمام احکام رخصت کے سفر متحقّق ہونے پر دائر کر دیے' خواہ کسی شخص کو سفر میں کوئی بھی مشقت نہ ہو' بلکہ اپنے گھر سے زیادہ آرام ملے' مگر قصر نماز اور رخصت روزہ وغیرہ کے احکام اس کو بھی شامل ہیں۔ اسی طرح نیند کی حالت میں چونکہ انسان بے خبر ہوتا ہے اور عادتاً ریح خارج ہو جاتی ہے' اس لیے خود نیند ہی کو خروجِ ریح کے قائم مقام قرار دے کر نیند سے وضو ٹوٹ جانے کا حکم دے دیا خواہ واقعہ میں ریح خارج ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔

مگر امام اعظم ابوحنیفہؒ نے عورت کے چہرے اور ہتھیلیاں کھولنے کو یہ درجہ نہیں دیا کہ چہرہ کھولنے ہی کو فتنہ کا قائم مقام قرار دے دیں' بلکہ حکم اس پر دائر رکھا کہ جہاں فتنہ یعنی عورت کی طرف قریب ہونے کے میلان کا خطرہ یا احتمال ہو وہاں ممنوع ہے اور جہاں یہ احتمال نہ ہو جائز ہے۔ مگر اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اس زمانے میں ایسا احتمال نہ ہونا بالکل شاذ ونادر ہے' اس لیے متاخرین فقہاءِ حنفیہ نے بھی بالآخر وہی حکم دے دیا جو ائمہ ثلاثہ نے دیا تھا' کہ جوان عورت کے چہرے یا ہتھیلیوں کی طرف بھی نظر ممنوع ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ اب باتفاق ائمہ اربعہ یہ تیسرا درجہ پردہ کا ممنوع ہو گیا کہ عورت برقع چادر وغیرہ میں پورے بدن کو چھپا کر مگر صرف چہرہ اور ہتھیلیوں کو کھول کر مَردوں کے سامنے آئے۔ اس لیے اب پردے کے صرف پہلے ہی دو درجے رہ گئے' ایک اصل مقصود یعنی عورتوں کا گھروں کے اندر رہنا' بلاضرورت باہر نہ نکلنا' اور دوسرا یعنی برقع وغیرہ کے ساتھ نکلنا ضرورت کی بنا پر بوقت ضرورت وبقدر ضرورت۔

مُنکرینِ حدیث کی گمراہی کے نتائج

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سورۃ النحل میں ارشاد ہوا :

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٤٤﴾﴾

''اور ہم نے یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح وتوضیح کیے جاؤ جو اُن کے لیے اتاری گئی ہے' اور تاکہ لوگ خود بھی غور وفکر کریں۔''

اِس آیت میں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تعلیم کی تشریح وتوضیح صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی' اور اپنی رہنمائی میں ایک پوری مسلم سوسائٹی کی تشکیل کر کے بھی' اور ذکرِ الٰہی کے منشا کے مطابق اُس کے نظام کو چلا کر بھی کی جائے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے وہ حکمت بیان کر دی ہے جس کا تقاضا یہ تھا کہ لازماً ایک انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا جائے۔ ذکر فرشتوں کے ذریعہ سے بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ براہِ راست چھاپ کر ایک ایک انسان تک بھی پہنچایا جا سکتا تھا۔ مگر محض ذکر بھیج دینے سے وہ مقصد پورا نہیں ہوسکتا تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت اور ربوبیت اُس کی تنزیل کی متقاضی تھی۔ اِس مقصد کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ اِس ذکر کو ایک قابل ترین انسان لے کر آئے۔ وہ اُس کو تھوڑا تھوڑا کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ جن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے' اُس کا مطلب سمجھائے۔ جنہیں کچھ شک ہو' اُن کا شک رفع کرے' جنہیں کوئی اعتراض ہو' اُن کے اعتراض کا جواب دے۔ جو نہ مانیں اور مخالفت اور مزاحمت کریں' اُن کے مقابلہ میں وہ اِس طرح کا رویّہ برت کر دکھائے جو اِس ذکر کے حاملین کی شان کے شایاں ہے۔ جو مان لیں اُنہیں زندگی کی ہر گوشے اور ہر پہلو کے متعلق ہدایات دے۔ اُن کے سامنے خود اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کرے' اور اُن کو انفرادی واجتماعی تربیت دے کر ساری دنیا کے سامنے ایک ایسی سوسائٹی کو بطور مثال رکھ دے جس کا پورا اجتماعی نظام ذکر کے منشا کی شرح ہو۔

یہ آیت جس طرح اُن منکرینِ نبوت کی حجت کے لیے قاطع تھی جو خدا کا ذکر بشر کے ذریعہ سے آنے کو نہیں مانتے تھے اِسی طرح آج یہ اُن منکرین حدیث کی حجت کے لیے بھی قاطع ہے جو نبی ﷺ کی تشریح وتوضیح کے بغیر صرف ذکر کو لے لینا چاہتے ہیں۔ وہ خواہ اِس بات کے قائل ہوں کہ نبی ﷺ نے تشریح وتوضیح کچھ بھی نہیں کی تھی صرف ذکر پیش کر دیا تھا' یا اِس کے قائل ہوں کہ ماننے کے لائق صرف ذکر ہے نہ کہ نبی ﷺ کی تشریح' یا اِس کے قائل ہوں کہ اب ہمارے لیے صرف ذکر کافی ہے نبی ﷺ کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں' یا اِس بات کے قائل ہوں کہ اب صرف ذکر ہی قابلِ اعتماد حالت میں باقی رہ گیا ہے' نبی ﷺ کی تشریح یا تو باقی ہی نہیں رہی یا باقی ہے بھی تو بھروسے کے لائق نہیں ہے' غرض ان چاروں باتوں میں سے جس بات کے بھی وہ قائل ہوں' ان کا مسلک بہرحال قرآن کی اس آیت سے ٹکراتا ہے۔

۱) اگر وہ پہلی بات کے قائل ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ (معاذ اللہ) نبی ﷺ نے اِس منشا ہی کو فوت کر دیا جس کی خاطر ذکر کو فرشتوں کے ہاتھ بھیجنے یا براہ راست لوگوں تک پہنچا دینے کے بجائے اسے واسطہ تبلیغ بنایا گیا تھا۔

۲) اور اگر وہ دوسری یا تیسری بات کے قائل ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں نے (معاذ اللہ) یہ فضول حرکت کی کہ اپنا ذکر ایک نبی کے ذریعہ سے بھیجا۔ کیونکہ نبی کی آمد کا حاصل بھی وہی ہے جو نبی کے بغیر صرف ذکر کے مطبوعہ شکل میں نازل ہوجانے کا ہوسکتا تھا۔

۳) اور اگر وہ چوتھی بات کے قائل ہیں تو دراصل یہ قرآن اور نبوتِ محمدی ﷺ' دونوں کے نسخ کا اعلان ہے' جس کے بعد اگر کوئی مسلک معقول باقی رہ جاتا ہے تو وہ صرف ان لوگوں کا مسلک ہے جو ایک نئی نبوت اور نئی وحی کے قائل ہیں۔ اس لیے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ خود قرآن مجید کے مقصدِ نزول کی تکمیل کے لیے نبی کی تشریح کو ناگزیر ٹھیرا رہا ہے اور نبی کی ضرورت ہی اس طرح ثابت کر رہا ہے کہ وہ ذکر کے منشا کی توضیح کرے۔ اب اگر منکرینِ حدیث کا یہ قول صحیح ہے کہ نبی کی توضیح وتشریح دنیا میں باقی نہیں رہی ہے تو اس کے دو نتیجے کھلے ہوئے ہیں۔ پہلا نتیجہ یہ ہے کہ نمونۂ اتباع کی حیثیت سے نبوتِ محمدیؐ ختم ہوگئی اور ہمارا تعلق محمد ﷺ کے ساتھ صرف اس طرح کا رہ گیا جیسا ہود اور صالح اور شعیب علیہم السلام کے ساتھ ہے کہ ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں' ان پر ایمان لاتے ہیں' مگر ان کا کوئی اسوہ ہمارے پاس نہیں ہے جس کا ہم اتباع کریں۔ یہ چیز نئی نبوت کی ضرورت

آپ سے آپ ثابت کر دیتی ہے' صرف ایک بے وقوف ہی اس کے بعد ختم نبوت پر اصرار کرسکتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اکیلا قرآن' نبی کی تشریح وتبیین کے بغیر' خود اپنے بھیجنے والے کے قول کے مطابق ہدایت کے لیے ناکافی ہے' اس لیے قرآن کے ماننے والے خواہ کتنے ہی زور سے چیخ چیخ کر اسے بجائے خود کافی قرار دیں' مدعی سست کی حمایت میں گواہانِ چست کی بات ہرگز نہیں چل سکتی اور ایک نئی کتاب کے نزول کی ضرورت آپ سے آپ خود قرآن کی رو سے ثابت ہو جاتی ہے۔ قَاتَلَهُمُ اللّٰه.....اس طرح یہ لوگ حقیقت میں انکارِ حدیث کے ذریعے سے دین کی جڑ کھود رہے ہیں۔

(مرسلہ: انجینئر نوید احمد)

❁❁❁

تذکارِ بگویہ (3 جلد)

متحدہ پنجاب کے ایک علمی اور روحانی خاندان کے حالات وتعلیمات

جلد اول: 1650ء تا 1945ء جلد دوم: 1945ء تا 1975ء

جلد سوم: برصغیر کے علماء اور مشاہیر کے خطوط اور توضیحی نوٹ

علمائے بگویہ کی علمی دینی اصلاحی اور روحانی خدماتِ جلیلہ کا تذکرہ

☆ایک جامع مرقع ☆ایک متوازن مطالعہ ☆ایک تابناک تذکرہ

مؤلف/مرتب: ڈاکٹر صاحبزادہ انوار احمد بگوی

صفحات: 2414 قیمت: -/2500 (علاوہ ڈاک خرچ)

ناشر: مجلس حزب الانصار' شارع بگویہ بھیرہ (40540) تحصیل بھیرہ' ضلع سرگودھا

048-6690847 , 0343-6668638 , 0337-0785462

تزکیۂ نفس

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

تزکیہ کے معنی ہیں کسی چیز کو صاف ستھرے طریقے سے پروان چڑھانا۔ پس تزکیہ نفس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنی زندگی میں خوبیوں کو اپناتا جائے اور برائیوں سے دور رہے۔ اس طرح نشوونما پانے والا نفس ترقی کی منازل بھی طے کرتا جائے گا اور وہ خیر سے قریب اور شر سے دور رہے گا۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں' کیونکہ شر میں لذت پوشیدہ ہے اور انسان بھاگ بھاگ کر برائی کی طرف جاتا ہے' چنانچہ شیطان ہمہ وقت برائی کی ترغیب دینے میں لگا رہتا ہے۔

تزکیۂ نفس کے لیے ہمیں اپنا جائزہ لینا ہے کہ ہم میں کیا کیا برائیاں ہیں اور ان کو کس طرح دور کرنا ہے۔ اس طرح یہ بھی دیکھنا ہے کہ کون کون سی اچھائیاں ہیں جن کو ہم اختیار نہیں کر سکے۔ اس طرح اپنی برائیوں سے شعوری طور پر آگاہ ہو کر ان کو دور کرنے کی کوشش کرنا اور نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف لپکنا تزکیہ نفس کی منزل کو آسان بنا دیتا ہے۔ جس چیز کو انسان اچھا جانتا ہے اسے کرنے میں وہ جلدی آمادہ ہو جاتا ہے' لہٰذا ضروری ہے کہ اسے نیکی اور بھلائی کی خوبی کا شعور حاصل ہو اور برائی کی ہلاکت کا یقین ہو۔ اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ انسان کو اپنے خالق و مالک کی شفقت کا یقین ہو جائے اور وہ جان جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے روکا ہے یقیناً وہ نقصان دہ اور مضر ہیں۔ ان سے اجتناب کرنے میں ہی فائدہ ہے۔ اسی طرح جن باتوں کے کرنے کا اس نے حکم دیا ہے ان کے کرنے میں کسی طرح کا نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اگر یہ یقین پختہ ہو جائے تو منزل آسان ہو جائے گی۔ اگر اللہ نے شراب سے روکا ہے تو ضرور یہ نقصان دہ ہے اور اس سے بچنا ہی خیریت کا باعث ہے۔ یوں سمجھئے کہ جو شخص برائی کے اجتناب کے راستے پر چل پڑا اور اسے ہمہ وقت نیکی اپنانے کا احساس لگا رہا تو وہ تزکیے کی منزل کی طرف رواں دواں ہو گیا۔

چونکہ تزکیۂ نفس کا تعلق عمل سے ہے اس لیے انسان کو اس حقیقت کا پختہ احساس ہونا

چاہیے کہ وہ ہمہ وقت زیرِنگرانی (under observation) ہے' یعنی سمیع و بصیر ہستی اُس کے ہر عمل سے واقف ہے۔ اگر اس نے کوئی کام اچھا یا برا لوگوں سے اوجھل ہو کر بھی کیا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور اس کے نامۂ اعمال میں اس کا اندراج ہو گیا ہے۔ یہ وہی نامۂ اعمال ہے جو فیصلے کے دن اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔ نامۂ اعمال نیکیوں کے اعتبار سے بھاری کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس میں بھلائیوں کا اندراج ہو لیکن وہ برائیوں سے خالی رہے۔ اگر انسان سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو معافی چاہے اور کوئی بھلائی کرے' اس طرح اس کی برائی محو کر دی جائے گی۔

عمر اللہ تعالیٰ کا انمول عطیہ ہے۔ یہ عمل کرنے کی مہلت اور حقیقی زندگی کی تیاری کا وقفہ ہے۔ اگر انسان اس کی اہمیت سے واقف ہو جائے تو اس کے لیے تزکیہ نفس کی راہ آسان ہو جاتی ہے۔ جب یہ زندگی ختم ہو جائے گی تو پھر اپنی برائیوں پر پچھتانا کام نہ آئے گا اور نہ ہی کسی کو نیکی کرنے کی مہلت ملے گی۔ اگر اس حقیقت کا گہرا ادراک ہو جائے تو برائی سے نفرت پیدا ہو جائے گی اور یہی بات نیکی کی طرف رغبت کا باعث ہو جائے گی۔ سنن ترمذی میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا آدمی سب سے بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جس کی عمر لمبی ہو اور عمل اچھا ہو''۔ اس نے پھر پوچھا: کون سا آدمی سب سے برا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جس کی عمر لمبی ہو اور عمل برا ہو''۔ اس حدیث میں زندگی کی اہمیت نہایت سادہ طریقے سے واضح کر دی گئی کہ جس شخص نے تزکیۂ نفس کے ساتھ زندگی گزاری وہ کامیاب رہا۔ وہ انتہائی سعادت مند اور کامران ہے۔ اس کی زندگی جتنی لمبی ہو گی اس کے لیے مفید تر ہو گی۔ اس کے برخلاف جس کی زندگی میں تزکیۂ نفس نہ ہوا اور اس نے خواہشاتِ انسانی کے تحت مہلت عمر گزاری' اپنے اعمال کو وسیلہ نجات نہ بنایا تو اس کی عمر جس قدر طویل ہو گی اس کا خسارہ اسی قدر بڑھتا جائے گا۔

تزکیہ نفس کی منزل حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے اندر برائی اور بھلائی کی جو تمیز فطری طور پر رکھی گئی ہے وہ اس سے آگاہ رہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ (الشمس)۔ اس طرح وہ برائی کو برائی اور نیکی کو نیکی جانے گا۔ جب بھی اسے کوئی اچھا کام کرنے کا موقع ملے گا تو اسے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت سمجھے گا اور اس پر عمل کر کے اللہ کی رضا حاصل کرے گا اور اگر اس کے ذہن میں کوئی برا خیال پیدا ہو تو سمجھ لے گا کہ یہ شیطان کی طرف سے وسوسہ ہے' جلدی سے اس موقع پر

اعوذ باللہ کہہ کر اللہ کی پناہ میں آ جائے گا اور برے خیال کو چھوڑ دے گا اور اس پر اللہ کا شکر بھی ادا کرے گا کہ اس نے برائی سے بچنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔

تزکیہ نفس کے لیے لمبی چوڑی ریاضتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلام کے تمام احکام متوازن ہیں۔ برائیوں سے بچنے کی شعوری کوشش کرتے رہنا اور بھلائی کے کاموں کی طرف رغبت رکھنا تزکیہ نفس کا باعث ہے۔ اپنی جان کو خواہ مخواہ میں مشقت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں' جیسے چلّے کاٹنا' آبادی سے دور ویرانے میں چلے جانا' خواہ مخواہ بھوک اور پیاس برداشت کرنا' عجیب وغریب غیر مسنون اوراد و وظائف کرنا' گھریلو زندگی سے فرار اختیار کرنا' نمازیں چھوڑ دینا یا تنہا نماز پڑھ لینا اور جماعت کو چھوڑنا اور ان مشقوں کو تزکیہ نفس سمجھنا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تمہارے اوپر تمہارے نفس کا بھی حق ہے' یعنی حصول تزکیہ کے لیے بھاری بھرکم مشقتیں اختیار کر کے جسم کو تکلیف میں نہ ڈالو۔ رسول اللہ ﷺ خود تزکیہ نفس کے اعلیٰ ترین معیار پر تھے مگر لذائذِ دنیا کو آپؐ نے ترک نہیں کیا۔ ہاں سہولتوں کے حصول میں آپ منہمک نہیں ہوئے' جو نعمت آپؐ کو میسر ہوئی آپؐ نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ تجرد کی زندگی اور ترکِ دنیا کی آپؐ نے تعلیم نہیں دی۔ آپؐ کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی بھرپور طریقے سے پوری ذمہ داریوں کے ساتھ گزارو مگر دیکھنا خواہشاتِ نفس اور شیطانی وسوسوں سے بچتے رہنا ہی تزکیہ نفس ہے۔

بخاری شریف کی ایک حدیث ہے جس کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس کا مفہوم اس طرح ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تین آدمی رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے ہاں گئے تاکہ حضور ﷺ کی عبادت کے متعلق استفسار کریں۔ جب ان کو بتایا گیا تو انہوں نے اسے قلیل سمجھا اور کہنے لگے کہ کہاں اللہ کے رسول ﷺ اور کہاں ہم! ان کی تو اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی گئیں (ان کو تو زیادہ عمل کی ضرورت نہیں)۔ ایک نے کہا: میں اب ہمیشہ رات نماز میں گزاروں گا' کمر بستر سے نہ لگاؤں گا۔ دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ دن کو روزہ رکھوں گا' ناغہ نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا: میں ہمیشہ عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپؐ ان کے پاس گئے اور ان سے فرمایا: اللہ کی قسم' میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور اس کی ناراضگی کی باتوں سے بچنے والا ہوں' لیکن میں روزے بھی رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں' میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں (یعنی ساری رات نماز نہیں پڑھتا) اور میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں اور ان کے ساتھ

ازدواجی زندگی گزارتا ہوں (یہ میرا طریقہ ہے) اب جو کوئی میرے اس طریقہ سے ہٹ کر چلے وہ میرا نہیں! (فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ!)

تزکیہ نفس کے ضمن میں یہ حدیث حرفِ آخر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو قرآن مجید میں بہترین نمونہ کہا گیا ہے۔ آپؐ کے طرزِ زندگی سے ہٹ کر کوئی انداز خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے اختیار کیا جائے وہ مقبول نہیں۔ قرآن مجید کا پڑھنا بہت بڑی نیکی ہے' لیکن یہاں بھی آپؐ کی تعلیم یہ ہے کہ جب تک تلاوت میں دل لگا رہے ٹھیک ہے' مگر جب ذرا تھکاوٹ محسوس ہو تو تلاوت مؤخر کر کے آرام کرو' طبیعت پر جبر کر کے یعنی باکراہ قرآن نہ پڑھو۔

سب سے بڑے مزکّی اور سب سے بڑے متّقی تو اللہ کے رسول ﷺ تھے۔ اب تزکیہ اور تقویٰ تو آپؐ کے طریقے کی پیروی ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کی زندگیاں بھی آپؐ کی پیروی میں تھیں۔ کسی نے اس راہ میں مشقت کا طریقہ نہیں اپنایا اور تجرد کی زندگی کو اختیار نہیں کیا۔ پس اگر کوئی شخص بغیر کسی فطری مجبوری یا معذوری کے گھریلو زندگی بسر کرنے سے ابا کرتا ہے تو اس کا طرزِ عمل خلافِ پیمبر ہونے کی بنا پر مسترد ہے' خواہ وہ عمل کیسا ہی خوش نما ہو۔ آپ ﷺ سے بڑا کوئی مزکی نہ ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ اب ہر کسی کے لیے آپؐ کا انداز ہی لائق تقلید ہے ؎

ترسم کہ بکعبہ نرسی اے اعرابی کیں راہ کہ تو می روی بترکستان است

''اے اعرابی! مجھے ڈر ہے کہ تو کعبہ شریف نہ پہنچ پائے گا' کیونکہ جس راستے پر تو چل رہا ہے یہ تو ترکستان کو جاتا ہے۔''

تمام کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں آپ ﷺ کے نقش قدم پر تھیں۔ نماز بہترین عبادت ہے۔ جس طرح نفلی روزے سارا سال رکھنے سے روکا گیا ہے اسی طرح ساری رات نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے' بلکہ بعض اوقات ایسے ہیں جن میں نماز پڑھنا حکماً منع ہے' مثلاً عصر کے بعد مغرب تک' پڑھے گا تو گنہگار ہوگا۔

الغرض جس طرح ساری خیر رسول اللہ ﷺ کے طریقے میں ہے اسی طرح آپؐ کے طریقے کو چھوڑ کر کوئی بھی طریقہ ایسا نہیں جس کو اختیار کر کے قبولیت کی اُمید رکھی جائے ؎

خلافِ پیمبرؐ کسے راہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

''جس نے پیغمبر ﷺ کے راستے کے خلاف راستہ اختیار کیا وہ کبھی بھی منزل تک نہیں پہنچ پائے گا۔''

نماز کے آداب اور ہماری کوتاہیاں

حافظ محمد زاہد☆

توحید و رسالت کی شہادت کے بعد نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ اور حج اسلام کے چار ارکان ہیں اوران چار میں سے بھی نماز اور روزہ کی زیادہ اہمیت ہے‘ اس لیے کہ یہ ہر مسلمان پر فرض ہیں‘ جبکہ زکوٰۃ تو صاحبِ نصاب پر اور حج صاحبِ استطاعت پر فرض ہے۔ پھر نماز اور روزے میں سے بھی نماز کو خاص اہمیت حاصل ہے بایں طور کہ یومیہ بنیادوں پر پانچ نمازوں کی ادائیگی ہر عاقل بالغ مسلمان پر ضروری ہے۔ نماز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں تقریباً ستّر (۷۰) بار نماز قائم کرنے کا حکم آیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا کہ مسلمان اور کافر میں بنیادی فرق نماز کا ہے۔

نبی اکرم ﷺ اور خلافت راشدہ کے دور میں تو کسی مسلمان کے بے نمازی ہونے کا خواب وخیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس دور میں منافقین بھی پہلی صف میں کھڑے نظر آتے تھے۔ مگر بہت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ہمارے معاشرے کی اکثریت کہنے کو تو مسلمان ہے مگر بے نمازی ہے۔ ایسے لوگوں سے گزارش ہے کہ وہ نام نہاد مسلمان بننے کے بجائے حقیقی مسلمان بنیں اور نماز کی پابندی کریں۔

دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو نماز جیسی اتنی اہم عبادت کے حوالے سے بھی ہمارے ہاں بہت سی کوتاہیاں پائی جاتی ہیں‘ جن کا اصل سبب ہماری بے احتیاطی اور عدم توجہی ہے۔ ذیل میں نماز کے آداب اور پھر اس تناظر میں پائی جانے والی عمومی کوتاہیوں کی نشان دہی مختصراً کی جاتی ہے۔ بعض مقامات پر سمجھانے کی غرض سے تصاویر سے بھی مدد لی گئی ہے۔

☆ وضو کے بعد **تحیّۃ الوضوء** اور مسجد میں آنے کے بعد **تحیّۃ المسجد** کے دو نفل پڑھنا بہت فضیلت کا باعث ہے‘ مگر مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اکثر نمازی حضرات مسجد میں آنے کے بعد وقت ہونے کے باوجود یہ نوافل نہیں پڑھتے۔ ہمیں چاہیے کہ نماز باجماعت میں اگر وقت باقی

☆ادارتی معاون‘ شعبہ مطبوعات‘ قرآن اکیڈمی‘ لاہور۔ 03214291904

ہو تو بیٹھنے اور باتیں کرنے کے بجائے ان نوافل کو ضرور ادا کریں۔

احادیث نبویہؐ میں ’’تحیّۃ المسجد‘‘ کی بہت تاکید آئی ہے‘ جسے نظرانداز کرنا ہرگز روا نہیں۔ حضرت ابوہریرہ h روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا دَخَلَ اَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ فَلَا یَجْلِسْ حَتّٰی یَرْکَعَ رَکْعَتَیْنِ))

(رواہ مسلم و ابن ماجہ)

’’جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو دو رکعت (نفل) ادا کیے بغیر نہ بیٹھے۔‘‘

☆ صف اول میں نماز پڑھنا اتنی فضیلت کا باعث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اذان اور صف اول میں شامل ہونے کا کتنا ثواب ہے تو پھر لوگ اس کے لیے ضرور قرعہ اندازی کریں۔‘‘ (صحیح البخاری) لیکن اس حوالے سے ہمارے ہاں یہ کوتاہی پائی جاتی ہے کہ اکثر لوگ مسجد میں آکر پچھلی صفوں میں بیٹھ جاتے ہیں حالانکہ پہلی صف میں جگہ خالی ہوتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اگر پہلی صف میں جگہ خالی ہو تو نمازیوں کا خیال کرتے ہوئے وہاں پہنچنے کو ترجیح دیں۔

☆ اصول یہ ہے کہ اگر پہلی صفوں میں جگہ خالی ہو تو بعد والوں کی نماز نہیں ہوتی‘ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ صفوں کے کناروں میں جگہ خالی ہوتی ہے اور لوگ جلدی میں صف کو مکمل کرنے کے بجائے پیچھے صف بنا لیتے ہیں۔ ایسا کرنا آداب کے خلاف ہے۔

☆ صف بندی کے حوالے سے ایک اصول یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ نابالغ بچہ اگر صف کے درمیان میں کھڑا ہو تو وہ صف نامکمل شمار ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ کوتاہی عام دیکھنے کو ملتی ہے کہ بعض نمازی اپنے نابالغ بچوں کو مساجد میں لاتے ہیں اور انہیں اپنے ساتھ کھڑا کرتے ہیں۔ اس طرح صف میں خلا رہ جاتا ہے۔ اس حوالے سے اصول یہ ہے کہ ایسا بچہ جو اپنی طہارت‘ وضو اور مسجد کے آداب کی سمجھ بوجھ نہ رکھتا ہوں اس کا تو مسجد میں آنا ہی ممنوع ہے‘ اور جو بچے ذرا سمجھ دار ہوں‘ لیکن ابھی بلوغت کی عمر کو نہ پہنچے ہوں تو ان کو صفوں کے کنارے پر کھڑا کرنا چاہیے۔

☆ بعض مساجد میں ضعیف لوگوں کے لیے صف کے کناروں پر کرسیاں رکھی جاتی ہیں‘ لیکن اگر کوئی کرسی خالی ہو تو اُسے پیچھے کر کے صف کو مکمل کرنا چاہیے ورنہ صف نامکمل رہے گی۔

☆ جب نماز کے لیے کھڑے ہوں تو قیام کا انداز نہ تو بہت ڈھیلا ڈھالا ہو کہ سستی کا شائبہ ہو اور نہ بہت اکڑا ہوا کہ غرور اور تکبّر کا شائبہ ہو‘ بلکہ معتدل انداز ہونا چاہیے اور دونوں پاؤں برابر

ہوں یعنی آگے پیچھے نہ ہوں۔

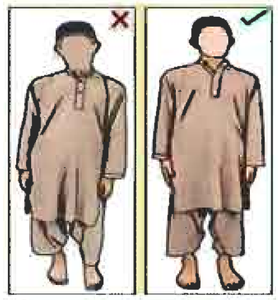

☆ قیام کی حالت میں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رُخ ہونی چاہئیں۔عموماً بہت سے لوگوں کی انگلیوں کا رُخ قبلہ کے بجائے شمال وجنوب کی طرف ہوتا ہے۔

☆ اذان کی طرح اقامت کا جواب دینا بھی بہت فضیلت کا باعث ہے' لیکن اکثر لوگ اقامت کا جواب نہیں دیتے۔اس حوالے سے یہ بھی ملحوظ رہے کہ اقامت کا جواب دل میں یا آہستہ آواز سے دیا جائے تاکہ شور کی کیفیت نہ ہو۔

☆ اقامت کے دوران ہاتھ کھلے رکھنے چاہئیں تاکہ نماز اور نماز سے پہلے کی حالت میں فرق نمایاں ہو' لیکن اکثر لوگ اقامت کے دوران ہی نماز کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔

☆ تکبیرِاولیٰ کے ساتھ نماز پڑھنے کی بہت فضیلت ہے' لیکن اس معاملے میں بھی کوتاہی نظر آتی ہے اور لوگ صفوں میں کھڑے ہوئے' صرف سستی کی بنا پر تکبیر اولیٰ چھوڑ کر اجرِ عظیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔بعض لوگ زبان سے نماز کی ''نیت'' کرتے کرتے تکبیر اولیٰ چھوڑ دیتے ہیں' حالانکہ نیت تو دل کی ہوتی ہے۔

☆ تکبیر کے وقت ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور انگلیاں قبلہ رخ ہونی چاہئیں' مگر مشاہدہ کیا گیا ہے کہ تکبیر اولیٰ کے دوران بعض لوگ اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اپنے چہرے اور کانوں کی طرف کرتے ہیں اور بعض نمازی حضرات کی انگلیاں تو سیدھی ہونے کے بجائے مڑی ہوئی ہوتی ہیں اور اس سے اُن کی عدمِ توجہی ظاہر ہو رہی ہوتی ہے۔اس کو صحیح طریقے سے ادا کرنے کے لیے شیشے کے سامنے کھڑے ہوکر پریکٹس کرنا مناسب ہے۔

☆ قیام کی حالت میں ہاتھ باندھنے کا طریقہ یہ ہے کہ دایاں ہاتھ بائیں کے اوپر ہو اور دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں سے کلائی کو پکڑا جائے۔بعض نمازی دائیں ہاتھ سے بائیں بازو کی کلائی کو پکڑ لیتے ہیں اور بایاں بازوں نیچے لٹک رہا ہوتا ہے۔یہ صحیح نہیں ہے۔

☆ قیام کی حالت میں ہاتھ بندھے رہنے چاہئیں' اور اگر کوئی اشد ضرورت محسوس ہو' مثلاً کہیں خارش وغیرہ ہو تو ایک ہاتھ کا استعمال کیا جاسکتا ہے' مگر بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ دونوں ہاتھوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔اس حوالے سے اصول یہ ہے کہ اگر کسی نمازی نے قیام کی حالت میں اپنے دونوں ہاتھ اتنی دیر چھوڑے رکھے جتنی دیر میں تین بار سبحان اللہ کہا جاتا ہے تو اس کی نماز ادا نہیں ہوتی۔

☆ بعض لوگ نماز باجماعت میں اُس وقت شریک ہوتے ہیں جب امام رکوع کی حالت میں ہوتا ہے۔وہ جلدی سے تکبیر اولیٰ کہتے ہی رکوع میں چلے جاتے ہیں اور ایک سیکنڈ کے لیے بھی قیام نہیں کرتے' حالانکہ قیام فرض ہے اور اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔اس حوالے سے یاد رکھیں کہ ایسی صورت میں اطمینان سے آکر صف میں کھڑے ہوکر تکبیر اولیٰ کہیں اور پھر دوسری تکبیر کہہ کر رکوع میں چلے جائیں۔اگر آپ امام کے اُٹھنے سے پہلے رکوع میں چلے گئے تو آپ کی یہ رکعت شمار ہوگی' ورنہ آپ کو یہ رکعت دوبارہ پڑھنی پڑے گی۔

☆ رکوع میں کمر بالکل سیدھی رہنی چاہیے' یعنی ۹۰ کا زاویہ بننا چاہیے' بایں طور کہ اگر اس پر پانی کا پیالا رکھ دیا جائے تو وہ بھی نہ گرے۔بعض نمازی رکوع میں ۷۵ کا زاویہ بنا رہے ہوتے ہیں تو بعض ۱۱۵ کا۔یعنی اُن کی کمر مکمل سیدھی نہیں ہوتی۔بغیر عذر کے ایسا کرنا صحیح نہیں ہے۔

☆ رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہونے کو ''قومہ'' کہتے ہیں اور یہ واجب ہے' لیکن بعض لوگ (خاص طور پر انفرادی نماز پڑھتے وقت) رکوع کے بعد سیدھا کھڑا نہیں ہوتے اور فوراً ہی سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ اس سے ایک واجب چھوٹ جاتا ہے اور اگر واجب چھوٹ جانے پر سجدۂ سہو نہ کیا جائے تو وہ نماز ادھوری رہتی ہے۔ اس لیے نمازی حضرات کو چاہیے کہ رکوع کے بعد مکمل طور پر سیدھے کھڑے ہوں اور پھر سجدہ کریں۔ قومہ کی حالت بالکل قیام جیسی ہونی چاہیے!

☆ بعض لوگ اُس وقت آتے ہیں جب امام رکوع کے بعد قومہ یا سجدے کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ امام کے کھڑے ہونے کا انتظار کرتے ہیں اور سجدے کی حالت میں امام کے ساتھ شامل نہیں ہوتے۔ شاید اس کی وجہ اُن کے ذہن میں یہ ہو کہ اب کون سی رکعت حاصل ہوگی۔ اس حوالے سے یاد رکھیں کہ امام چاہے قومہ کی حالت میں ہو یا سجدے میں' دونوں صورتوں میں امام کے ساتھ شامل ہونا چاہیے۔ یہی صورتِ حال قعدۂ اولیٰ کے وقت ہوتی ہے کہ لوگ امام کے قعدۂ اولیٰ سے اُٹھنے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اس صورت میں بھی آنے والے کو چاہیے کہ وہ تکبیر کہہ کر قعدہ میں امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔

☆ سجدہ کرتے وقت پہلے ہاتھ' پھر ناک اور پھر پیشانی زمین پر رکھنی چاہیے' مگر اکثر لوگ پہلے پیشانی رکھتے ہیں اور بعد میں ناک' اور بعض لوگ تو ناک زمین پر لگاتے ہی نہیں ہیں۔

☆ سجدے کے دوران دونوں پاؤں کا زمین پر لگانا ضروری ہے۔ سجدے کے دوران اگر بغیر کسی عذر کے دونوں پاؤں زمین سے اُٹھ جائیں تو نماز نہیں ہوگی۔ کئی دفعہ دیکھا گیا ہے کہ بعض نمازی حضرات (جن کو شاید اس مسئلہ کا پتا نہیں ہوتا) سجدہ کے دوران دونوں پاؤں زمین سے اُٹھا لیتے ہیں۔ مزید برآں سجدے کے دوران پاؤں کی انگلیاں قبلہ رُخ ہونی چاہئیں۔

☆ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سجدہ کے دوران نمازی کے بازو یا تو زمین پر بچھے ہوئے ہوتے ہیں یا پھر پہلو (ران' پسلیوں یا پیٹ) کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے درست نہیں ہیں۔ سجدہ کے دوران بازو زمین سے اوپر اور پہلو سے الگ ہونے چاہئیں۔

☆ دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان سے بیٹھنے کو (جس میں کمر مکمل سیدھی ہو جائے) ''جلسہ'' کہا جاتا ہے اور یہ واجب ہے۔ اگر کوئی شخص اطمینان سے جلسہ نہیں کرتا تو اس کی نماز واجب چھوڑنے کی وجہ سے نامکمل ہوگی۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ بائیں پاؤں کو بچھا کر اُس پر بیٹھا جائے اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھا جائے۔ دائیں پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ ہونی چاہئیں۔

☆ سجدے اور قعدہ سے اُٹھتے وقت بغیر کسی مجبوری کے ہاتھوں کو زمین پر رکھ کر اُٹھنا مکروہ ہے' البتہ اگر کوئی مجبوری ہو تو ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

☆ چار رکعات والی نماز کے دوران' دو رکعت کے بعد بیٹھنے کو ''قعدۂ اولیٰ'' کہا جاتا ہے۔ قعدہ میں بیٹھنے کا طریقہ وہی ہے جو دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے کا ہے۔

☆ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قعدہ اولیٰ کے دوران کوئی شخص تشہد (اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ.....) کے بعد اگر درود شریف کے تین الفاظ یعنی ''اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی'' سے زیادہ پڑھ لے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہو جاتا ہے۔

☆ جلسہ' قعدۂ اولیٰ اور قعدۂ اخیرہ کے دوران ہاتھوں کی اُنگلیوں کے سرے گھٹنوں پر ہونے چاہئیں تاکہ اُن کا رخ قبلہ کی جانب ہو' مگر بعض لوگ قعدہ کی حالت میں اپنے گھٹنوں کو رکوع کی حالت کی طرح پکڑ لیتے ہیں جس سے اُن کی آدھی اُنگلیاں گھٹنوں سے نیچے ہوتی ہیں اور اس طرح انگلیوں کا رُخ قبلہ کے بجائے زمین کی طرف ہو جاتا ہے۔ قعدہ کی حالت میں گھٹنوں کو پکڑنے کے بجائے ہاتھوں کو گھٹنوں کے اوپر رکھا جاتا ہے۔

☆ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ ایک دو رکعت کے بعد امام کے ساتھ شامل ہوئے ہوتے ہیں' امام جیسے ہی ایک طرف سلام پھیرتا ہے تو وہ فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں' حالانکہ اس حوالے سے قاعدہ یہ ہے کہ جب امام دوسری طرف سلام پھیرے تب کھڑا ہوا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ نماز کے دوران امام سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو اور وہ پہلے سلام کے بعد سجدۂ سہو کرے۔

☆ اگر کسی شخص سے امام کی اقتدا میں نماز پڑھتے ہوئے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جائے جس

سے سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے تو امام کی اقتدا کی وجہ سے اُس پر سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔ البتہ اگر کسی شخص نے امام کے ساتھ دو رکعات ادا کیں اور باقی دو رکعات امام کے بعد پڑھ رہا تھا اور اُس میں کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو پھر سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

☆ باجماعت نماز کے دوران امام کی اقتدا بہرصورت لازم ہے۔ بعض نمازی امام کے رکوع یا سجدہ میں جانے سے پہلے رکوع اور سجدہ میں چلے جاتے ہیں۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے اور احادیث میں اس پر سخت وعید آئی ہے کہ ایسا کرنے والے شخص کا منہ گدھے جیسا بنا دیا جائے گا۔

☆ اگر کوئی شخص چار رکعات والی نماز یعنی ظہر، عصر اور عشاء کی آخری رکعت میں امام کے ساتھ شامل ہوا تو یہ شخص امام کے سلام پھیرنے کے بعد کھڑا ہو کر اپنی پہلی رکعت پڑھے گا اور اس رکعت کے بعد قعدۂ اولیٰ کرے گا، اس طرح اس کی دو رکعت ہوگئیں۔ اس کے بعد وہ اپنی دوسری اور تیسری رکعت پڑھے گا۔ مغرب کی نماز میں اگر کوئی شخص آخری رکعت میں آیا ہے تو وہ بھی ایک رکعت پڑھنے کے بعد قعدۂ اولیٰ کرے گا اور پھر تیسری رکعت ادا کرے گا۔ بعض لوگ امام کے ساتھ ایک رکعت ادا کرنے کے باجود الگ سے اپنی دو رکعت پوری کر کے قعدۂ اولیٰ کرتے ہیں جو غلط ہے۔ اس اصول کو بھی ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔

☆ اگر کسی شخص نے (مثلاً نمازِ ظہر میں) امام کے ساتھ آخری دو رکعات پڑھی ہیں تو وہ کھڑا ہو کر اپنی پہلی دو رکعت اس طرح ادا کرے گا جس طرح وہ انفرادی طور پر اپنی پہلی دو رکعات ادا کرتا ہے۔ یعنی پہلے وہ ثناء، پھر سورۃ الفاتحہ پڑھے گا اور پھر آخر میں کوئی سورۃ ملائے گا۔ بعض لوگ امام سے رہ جانے والی رکعات کو آخری رکعات کی طرح پڑھتے ہیں، یعنی صرف سورۃ الفاتحہ پڑھتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے۔

☆ بعض لوگ جمعہ کے خطبہ کے دوران باتیں کرتے رہتے ہیں، جبکہ اس کے بارے میں اصول یہ ہے کہ خطبہ کو غور سے سنا جائے اور اگر آپ کے اردگرد کوئی شخص باتیں کر رہا ہو تو اس کو زبان سے منع کرنے کے بجائے اشارہ سے چپ کرانا چاہیے۔ اگر دورانِ خطبہ رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہو تو درود پاک بھی دل میں بغیر آواز کے پڑھنا چاہیے۔ اسی طرح اگر خطبہ کے دوران کسی دعا کا ذکر آئے تو اس پر آمین بھی دل میں کہنی چاہیے۔

☆ بعض لوگ کرسی پر نماز پڑھتے ہیں، اس حوالے سے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ بلا عذر کرسی پر بیٹھ کر نماز ادا کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔ اور اگر عذر ہو تو اس کی دو حالتیں ہیں:

(۱) ایسا شخص جو نہ قیام پر قادر ہو اور نہ رکوع و سجود پر۔ اس صورت میں یہ شخص اپنی کرسی کے پچھلے پائے نمازیوں کے پاؤں کے بالمقابل رکھے۔ اس طرح اگرچہ اس کے پاؤں اور نمازیوں کے پاؤں برابر نہیں ہوں گے، لیکن کندھے اور بدن نمازیوں کے برابر ہوگا۔ (۲) ایسا شخص جو قیام پر تو قادر ہو لیکن رکوع و سجود بیٹھ کر ہی ادا کر سکتا ہو۔ اس صورت میں یہ شخص اپنی کرسی کے اگلے پائے نمازیوں کے پاؤں کے برابر رکھے۔ اس طرح کرسی رکھنے سے یہ قباحت لازم آتی ہے کہ کرسی کے پچھلے پائے پچھلی صف میں آتے ہیں اور اس سے پچھلی صف میں خلا واقع ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے نمازی کے لیے بہتر ہے کہ وہ اپنی کرسی صف کے کنارے پر رکھے تاکہ اس کے پیچھے کسی نمازی کو کھڑا ہونے کی ضرورت نہ ہو۔

☆ کرسی پر نماز پڑھنے کے حوالے سے ایک کوتاہی یہ دیکھنے میں آتی ہے کہ بعض لوگ ایسی کرسی پر نماز پڑھتے ہیں جس کے سامنے کوئی تختہ لگا ہوتا ہے اور پھر اُسی پر ماتھا ٹیکتے یعنی سجدہ کرتے ہیں۔ یہ غلط ہے، اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

☆ وتر میں دعائے قنوت کا پڑھنا واجب ہے، مگر بعض لوگ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ ہمیں دعائے قنوت نہیں آتی اور ہم اس کی جگہ تین بار سورۃ الاخلاص پڑھ لیتے ہیں۔ اس حوالے سے یاد رکھیں کہ وتر میں دعائے قنوت پڑھنا واجب ہے اور اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص وتر میں دعائے قنوت نہیں پڑھتا تو اُس کے وتر واجب چھوٹنے کی وجہ سے نامکمل رہیں گے۔ ایسے لوگوں سے گزارش ہے کہ وہ دعائے قنوت ضرور یاد کریں۔

آخر میں تمام مسلمانوں سے گزارش ہے کہ نماز جیسی عبادت کے بارے میں سستی کا مظاہرہ نہ کریں اور نماز کو مکمل احکام اور پورے آداب کی رعایت رکھتے ہوئے ادا کریں تاکہ ان نمازوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں قبولیت کا درجہ ملے اور آخرت میں ہم اجرِ عظیم کے مستحق قرار پائیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ ماقبل بیان کردہ نماز کے آداب اور اصول وضوابط کا خود خیال رکھیں اور اسے دوسروں تک بھی ضرور پہنچائیں۔ یہ یقینی طور پر صدقہ جاریہ ہے۔

❁❁❁

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا

شیطانی حملہ

آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک

پروفیسر عبداللہ شاہین

اللہ تعالیٰ نے اولاً آدم علیہ السلام کو اور بعد ازاں ان کی موانست کے لیے حوا علیہا السلام کو پیدا کر کے حکم جاری کیا:

﴿..... يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣٥﴾﴾ (البقرۃ)

''.....اے آدمؑ! تم اور تمہاری بیوی' دونوں جنت میں رہو اور یہاں جو چاہو خوب کھاؤ' مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا' ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔''

یہ مضمون سورۃ الاعراف (آیت ۱۹) میں بھی تقریباً انہی الفاظ میں وارد ہوا ہے۔

اب ان کے ازلی و دائمی دشمن شیطان نے انہیں بہکایا' جس کا مقصد یہ تھا:

﴿..... لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا﴾ (الاعراف: ۲۰)

''.....تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے۔''

نتیجہ یہ ہوا کہ:

﴿..... فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا﴾ (الاعراف: ۲۲)

''.....پھر جب انہوں نے اس کا مزہ چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے۔''

مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں سید مودودیؒ رقم طراز ہیں:

''.....انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا اوّلین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں انسان کو فطرتاً محسوس ہوتی ہے..... شیطان کی پہلی چال' جو اُس نے انسان کو فطرتِ انسانی کی سیدھی راہ سے ہٹانے کے لیے چلی' یہ تھی کہ اس کے اس جذبۂ شرم و حیا پر ضرب لگائے اور

برہنگی کے راستے سے اس کے لیے فواحش کا دروازہ کھولے اور اس کو جنسی معاملات میں بدراہ کر دے۔ (چنانچہ)..... شیاطین اور اُن کے شاگردوں کی یہ روش آج تک جوں کی توں قائم ہے۔''

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر گوہر مشتاق اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''معرکۂ روح و بدن'' میں گوہر فشاں ہیں:

حضور ﷺ نے اپنی احادیث میں قیامت کی جو نشانیاں بتائی تھیں' ان میں یہ ذکر تھا کہ ''گھر گھر میں عورتیں ناچیں گی اور فتنہ ہر گھر میں گھس جائے گا'' — آج ٹی وی سے زیادہ اس حدیث کا مصداق اور کوئی نہیں' جس کے ذریعہ مسلمانوں میں غیر اسلامی باتیں انتہائی تیزی سے پھیلائی جا رہی ہیں۔ غیر مسلموں کا ایک مخصوص ایجنڈا ہے کہ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلائی جائے تاکہ ان میں ایڈز کے مریض کی طرح ہر غلط چیز کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ختم ہو جائے۔

حدیث رسول ﷺ ہے: ''میں تمہیں دجال کے متعلق ایسی بات بتاؤں گا جو مجھ سے پہلے نبیوں نے نہیں بتائی۔ وہ یہ کہ دجال کی ایک آنکھ ہو گی۔''

غور سے دیکھیں تو ٹی وی' کیبل' ڈش' ویڈیو کیمرہ اور کمپیوٹر' انٹرنیٹ وغیرہ ایک آنکھ والے دجال کے ایجنٹ ہیں' جو ہر گھر میں گھس کر فساد پھیلا رہے ہیں۔

قرآن میں شراب اور جوئے (کی قطعی حرمت سے پہلے) کے متعلق ذکر ہے کہ ان کے کچھ فائدے بھی ہیں' لیکن نقصانات ان کے فائدوں سے زیادہ ہیں — کچھ یہی حال ٹی وی کا بھی ہے — یہ درست ہے کہ ٹی وی پر تلاوت اور فہم قرآن کے پروگرام دکھائے جاتے ہیں' مگر ان کے فوراً بعد بے ہودہ اور لایعنی پروگرام پیش کر کے قرآن کے اثر کو زائل کر دیا جاتا ہے۔ پھر خود تلاوتِ قرآن کرنے اور اس کا ترجمہ پڑھنے سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ ٹی وی پر تلاوت سننے سے کہیں زیادہ ہے۔

ٹی وی دیکھنے کے نقصانات کی ایک مثال یہ ہے کہ جن مسلمانوں نے Mel Gibson کی ہالی وڈ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی پر بنائی گئی' جھوٹی فلم Passion of Christ دیکھی' ان لوگوں نے مسلمان ہونے کے باوجود فلم کے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انتہائی تکلیف دہ حالت میں صلیب پر پھانسی پاتے اور قتل ہوتے ہوئے دیکھ کر بہت آنسو بہائے' حالانکہ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پھانسی دی گئی' نہ قتل کیا جا سکا بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمانوں پر اٹھا لیا۔ بحوالۂ عبارتِ قرآنی:

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ (النساء:۱۵۷)

''اوران لوگوں نے نہ تو مسیح کو قتل کیا اور نہ ہی صلیب پر چڑھایا' بلکہ ان کے لیے اس کی شبیہہ بنادی گئی۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اور یقینی بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے مسیح کو قتل نہیں کیا' بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُس کو اپنے پاس (آسمانوں پر) اٹھالیا۔''

رہی ٹی وی پر خبروں کے حصول کی بات تو اس کی افادیت بھی محل نظر ہے — نیل پوسٹ مین (Neil Postman) امریکہ کا ایک بڑا مفکّر ہے اور نیویارک یونیورسٹی کے کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ہے۔ اس نے اپنی کتاب "How to watch T.V News" میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ٹی وی پر خبروں کا اصل مقصد لوگوں میں سنسنی پھیلانا اور اشتہارات کا فروغ ہوتا ہے[1] (جوٹی وی والوں کا business ہے) — اس کی نسبت جو لوگ اخبارات

(۱) امریکہ میں ٹی وی پر خبروں کو چار بڑی کمپنیاں کنٹرول کرتی ہیں جو کہ NBC,CBS,ABC اور CNN ہیں۔ ان میں سے دو کمپنیاں اسلحہ بیچنے کا کام بھی کرتی ہیں' یعنی NBC جو کہ اسلحہ بنانے والی کمپنی "General Electric" کی ملکیت ہے اور CBS نیوز جو کہ "Westing house" کی ملکیت ہے۔ جہاں تک بقیہ دونوں نیوز کمپنیوں کا تعلق ہے تو CNN کی مالک "Time Warner" ہے اور ABC نیوز کی مالک "Disney" ہے اور یہ دونوں کمپنیاں تفریح اور کھیل (Fun and Games) مہیا کرنے کی سب سے بڑی کمپنیاں ہیں۔ اور واقعتاً اس وقت دنیا میں الیکٹرانک میڈیا' خصوصاً ٹی وی پر کھیل کود کی چیزیں جیسے Games اور Sports تو پوری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ کہیں تیراکی ہے' کہیں ٹینس' کہیں ہاکی' فٹ بال' کرکٹ اور آئے دن ان کے ٹورنامنٹس — ایکٹرز' ایکٹریسز' ان کی زندگیاں اور سکینڈل — یہی کچھ پیغمبر اسلام ﷺ کے دور کے ایک کافر نضر بن حارث نے کیا تھا کہ ملک شام سے ایک مغنیہ خرید کر لایا تاکہ نوجوان رات کو اس کے گانے سنیں اور دن کو سوئیں' جس کی مذمت سورۂ لقمان میں یوں کی گئی ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ ''اور لوگوں میں سے کچھ وہ ہیں جو کھیل کود کی چیزیں خریدتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں بغیر کسی علمی دلیل کے اور اس کو ہنسی بنالیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے دردد ینے والا عذاب ہے'' — اور یہی کچھ آج کل بھی الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے سے کیا جارہا ہے۔

پڑھتے ہیں' وہ ان لوگوں کے مقابلے میں جو ٹی وی پر خبریں دیکھتے ہیں' ملکی حالات سے کہیں زیادہ باخبر ہوتے ہیں (کیونکہ اخبار میں خبر زیادہ تفصیل سے دی گئی ہوتی ہے) — ٹی وی پر ہر وقت موسیقی (Back Ground Music) بجتی ہے' حالانکہ پیغمبر اسلام (ﷺ) نے واضح طور پر موسیقی کو حرام قرار دیا ہے۔ نیز ٹی وی ڈرامے جن کے انتظار میں لوگ بے چین ہوتے ہیں اور شام کی مصروفیات کو ان ڈراموں کے اوقات کی نسبت سے ترتیب دیتے ہیں' تاکہ کہیں ڈرامے کی کوئی قسط مس (miss) نہ ہو جائے' یہ ڈرامے ان لوگوں کو مادہ پرست بناتے ہیں اور مذہبی روایات سے بغاوت سکھاتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کی کئی سالوں کی تحقیق کا نچوڑ یہ ہے کہ لوگ جب ٹی وی پروگرام دیکھتے ہیں تو ان میں پیش کیے گئے حالات وواقعات کو لاشعوری طور پر اپنی روزمرہ زندگی پر نافذ (apply) کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان میں جذباتیت کا رجحان بھڑکانے میں ٹی وی پروگراموں کا بہت دخل ہوتا ہے۔

امریکہ کے اربابِ فکر ونظر نے ٹی وی کے نقصانات کا سائنسی تجزیہ کر کے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں نیل پوسٹ مین کی کتاب "Amusing Ourselves to Death" جیری مینڈر کی کتاب "Four Arguments for Elimination of Television" اور میری ون کی کتاب "The Plug in Drugs" بہت اہم کتابیں ہیں۔ جیری مینڈر (Jerry Mander) کی تو اپنی اشتہارات کی کمپنی تھی جس کی اس نے ۱۵ سال تک صدارت کی اور پھر ٹی وی کے بزنس سے توبہ کی اور گھر کا بھیدی ہونے کی حیثیت سے ٹی وی اور کمپیوٹر (انٹرنیٹ) کی سیاہ کاریوں کے متعلق ایک تحریک شروع کی — ان تمام محققین کی ریسرچ کا نچوڑ یہ ہے کہ:

(۱) ٹی وی اور کمپیوٹر کی سکرین سے شعاعیں (Cathode rays) نکلتی ہیں۔ یہ شعاعیں ہمارے دماغ پر غالب آجاتی ہیں' جس کے نتیجہ میں ہمارے دماغ میں پیدا ہونے والی نیوروکیمیکلز (Neuro Chemicals) میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ اس کے سب سے مہلک اثرات خصوصاً بچوں اور حاملہ خواتین پر پڑتے ہیں۔

(۲) اس خیال سے کہ بچے تنگ نہ کریں' والدین انہیں کارٹون دیکھنے کے لیے ٹی وی یا کمپیوٹر کے آگے بٹھا دیتے ہیں' جہاں وہ پہروں بلی چوہے کا کھیل دیکھتے رہتے ہیں۔ یوں بچے وقتی طور پر تو بہل جاتے ہیں مگر ان کی اس لایعنی مصروفیت کی قیمت بعد میں

نفسیاتی نقصانات کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے — کارٹون دیکھنے دکھانے کے مشغلہ سے بہتر ہے کہ میاں بیوی میں سے کوئی ایک انہیں کوئی اسلامی کتاب یا رسالہ پڑھ کر سنائے — بچوں کو اسلامی کہانیاں سنانا بظاہر تو بہت چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے' مگر بیسویں صدی کے عظیم سائنس دان آئن سٹائن کا کہنا ہے کہ ''اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ ذہین بنے تو اسے کہانیاں سنائیں'' —— یہی وجہ ہے کہ دادی اماں کا بچوں کو مسلمان مشاہیر کی زندگیوں سے متعلق کہانیاں سنانا بہت مفید اور بہتر مشغلہ تھا۔

ٹی وی کی ماں یعنی کمپیوٹر کا بچوں کو سکھانا اور ان کا انٹرنیٹ پر chatting کرنا ایک قابلیت سمجھی جاتی ہے' حالانکہ اصل قابلیت تعلیم اور مطالعۂ کتب سے حاصل ہوتی ہے۔

سوانح عمریوں کے بچوں اور نوجوانوں کے ذہنوں پر بہت گہرے نقوش مرتب ہوتے ہیں۔ مشہور امریکی سائیکالوجسٹ Scott Peck نے اپنی کتاب "The Road Less Travelled" میں لکھا ہے کہ سوانح عمریوں کا بچوں اور نوجوانوں کے ذہنوں پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے' کیونکہ وہ غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی رول ماڈل کو ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ جب ہم اپنے بچوں کو اسلامی رول ماڈل مہیا نہ کریں تو وہ اپنی ذہنی ضرورت کی وجہ سے ٹی وی یا فلموں سے کسی ایکٹر یا کسی کھلاڑی کو اپنا رول ماڈل بنا لیتے ہیں اور پھر اسی کی طرح بننے میں اپنی صلاحیتیں لگا دیتے ہیں۔

نشہ آور چیزوں میں ایک قسم جڑی بوٹیوں کی ہے' جیسے بھنگ' چرس' افیون اور ہیروئن' جن سے ذہنی و دماغی نشہ ہوتا ہے۔ لیکن نشہ کی ایک قسم بقول ''میری ون'' بجلی سے چلنے والے آلات ہیں' جنہیں Plug in Drugs کہا گیا ہے' یعنی ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ وغیرہ۔ ان سے ''آنکھ کا نشہ'' حاصل ہوتا ہے — جس کے مضر اثرات کی ایک مثال بیری سینڈر کی کتاب "In the absence of a sacred" میں یوں موجود ہے — کینیڈا کے ایک شہر میں ریڈ انڈین قبائل آباد تھے جن کا رہن سہن مسلمان معاشرے جیسا تھا' یعنی اپنے بزرگوں کا احترام۔ وہاں کے سفید فام حکمرانوں نے ان لوگوں کو اپنے جیسا بنانے کی کوششیں کیں مگر ناکام رہے۔ آخر انہوں نے ان قبائل میں مفت ٹی وی سیٹ تقسیم کیے اور ٹی وی چینل پر اپنی پسند کے پروگرام نشر کیے۔ پھر کیا تھا! بیس سال کے اندر اندر ریڈ انڈین قبائل کا معاشرتی نظام تباہ ہو کے رہ گیا' ان میں بے راہ روی پھیلنا شروع ہوگئی اور نوجوانوں نے اپنے والدین کے

خلاف بغاوت کر دی — جو کام دوسرے ذرائع نہ کر سکے' وہ ٹی وی نے بڑی کامیابی سے کر دکھایا — پاکستان یا بیرونِ پاکستان مسلم ممالک میں بڑے بوڑھے یا گھر کے سربراہ حضرات خاص طور پر ڈش ٹی وی یا کیبل لگواتے ہیں اور کہتے ہیں: ارے بھئی' ہم نے ٹی وی پر خبریں دیکھنی ہوتی ہیں' حالانکہ جب وہ حضرات گھر سے باہر ملازمت وغیرہ پر یا مسجد میں ''اللہ اللہ'' کرنے جائیں گے تو ان کی غیر موجودگی میں ان کے گھر والے ''اسلامی پروگرام'' نہیں دیکھیں گے' بلکہ انہی چیزوں کی طرف کھنچیں گے جن کی طرف ان کی جذباتی وابستگی ہوگی یا جو پیغام الیکٹرانک میڈیا لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔

انٹرنیٹ جو چالیس چوروں (یعنی الیکٹرونک میڈیا) کا ''علی بابا'' ہے' اس کا مخفف w.w.w (world wide web) ہے جس کا عربی ترجمہ بھی ''البیت العنکبوت العالمی'' کیا جاتا ہے۔ اور واقعی یہ مکڑی کے جالے کی مانند ہے جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ جس طرح مکڑی اپنے شکار مکھی وغیرہ کے گرد جالا لپیٹ کر اسے بے بس اور بے حرکت بنا دیتی ہے اور بعد ازاں اس کے جسم میں سے تمام حیاتیاتی مادے (body fluids) چوس کر اس کا خول جالے میں چھوڑ دیتی ہے' اسی طرح میڈیا کے جال' وسوسوں اور نظر کے دھوکوں (seduction) کا شکار وہی لوگ ہوتے ہیں جو ڈش اور کیبل ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر یا انٹرنیٹ پر ویب سرفنگ اور چیٹنگ کر کے اپنا وقت ضائع کرتے ہیں' اور کامیاب لوگ وہی ہیں جو قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنے' سیرتِ نبوی ﷺ' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مسلمان علماء (مثلاً امام ابوحنیفہ' امام شافعی' امام احمد' امام مالک' امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ وغیرہم) کی سوانح عمریاں پڑھنے اور نیک لوگوں کی صحبت میں گزارتے ہیں۔ (ماخوذ از: ''معرکہ روح و بدن'' ڈاکٹر گوہر مشتاق)

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک جامع خطاب

صفحات: 72 ❁ قیمت (اشاعت خاص): 40 روپے

فلسفۂ موت وحیات

راحیل گوہر

ارسطو انسانی روح کے دو درجے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''انسانی روح حیوانی روح (Animal Soul) کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی فنا ہو جاتی ہے' لیکن روح عقلی (Rational Soul) ازلی اور ابدی ہوتی ہے۔ اس کی کیفیات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور یہ جسم کی موت سے متاثر نہیں ہوتی۔ ادراک کے ذریعہ سے روح محسوس اشیاء کا علم حاصل کرتی ہے اور عقل کے ذریعہ سے تصورات کو قائم کرتی ہے۔ ارسطو ان دونوں عقلوں میں ایک کو فعالی (Active) اور دوسری کو انفعالی (Passsive) قرار دیتا ہے۔ ایک وہ جو سب کچھ کرتی ہے اور دوسری وہ جس پر سب کچھ وارد ہوتا ہے۔ ادراک' تخیل اور حافظہ کا تعلق جسم سے ہے' اس لیے اس کے ساتھ ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ فعالی عقل ازلی وابدی ہے۔ فعالی عقل' جسم اور انفعالی عقل سے پہلے ہی موجود تھی۔ چنانچہ یہ بالکل غیر مادی اور ناقابل فنا ہے۔ اور یہ فعالی عقل خدائی ذہن کی ایک چنگاری ہے جو خارج سے روح میں آتی ہے۔''

عصرِ حاضر کا سیکولر ازم انسان کو محض ایک حیاتیاتی (Biological) وجود تسلیم کرتا ہے' جس کا خمیر مادّہ' عقل' نفسانی جذبات اور خواہشات کا مرکب ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان روح و بدن' عقل وشعور اور جذبات واحساسات' خیر وشر کے ادراک' ارادہ واختیار کا مالک' ایک ذمہ دار اور اخلاقی وجود (Moral certainty) ہے۔ انسانی وجود کا جزو اعظم جو مرکزی حیثیت کا حامل ہے' وہ روح ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ روح اس جسد خاکی کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ عقل وشعور اور فہم وادراک بھی دراصل روح کی ہی کارفرمائی ہے' ورنہ جان تو نباتات اور حیوانات میں بھی ہوتی ہے' لیکن وہ اپنی جبلّتوں (instincts) کے علاوہ کسی اور عمل کا شعور واحساس نہیں رکھتے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ موت انسان کے مٹ جانے یا معدوم ہو جانے کا نام نہیں' موت دراصل زندگی کا تسلسل ہے۔ انسان کی مہلت عمر ختم ہونے تک یہ خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ حیاتِ دنیوی کے ارتقاء کا سفر موت کی آمد کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ تاہم ارتقاءِ حیات کے اس طویل سفر میں انسان کا نفسِ مُلہِمہ (intellect) فعّال رہتا ہے۔ جسم پیوند خاک ہو جاتا ہے مگر اس کی روحِ عقلی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جس طرح پانی ٹھوس شکل میں ہو' مائع یا گیس کی صورت میں' اس کی اجزائے ترکیبی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ تحلیل شدہ تینوں حالتوں میں آکسیجن اور ہائیڈروجن کا تناسب یکساں رہتا ہے۔ گویا موت انسان کے اجزائے بدن کو منتشر (disperse) ضرور کر دیتی ہے مگر اس کے روحانی وجود میں کوئی تغیر وتبدل واقع نہیں ہوتا۔ بقول چکبست:

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

امام غزالیؒ 'احیاء العلوم' میں فرماتے ہیں:

''موت صرف حال کے بدلے کا نام ہے۔ اور روح جسم سے جدا ہونے کے بعد یا تو عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے یا آسائش اور چین کی حالت میں ہوتی ہے۔ روح کے جسم سے جدا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا تصرف جسم پر سے جاتا رہتا ہے اور جسم اس کی اطاعت سے باہر ہو جاتا ہے' یعنی انسانی اعضاء و جوارح سب کے سب روح کے آلات ہیں کہ وہ ان سے کام لیا کرتی ہے' مثلاً ہاتھ سے پکڑتی' کان سے سنتی' آنکھ سے دیکھتی اور دل سے اشیاء کی حقیقت کا ادراک کرتی ہے۔ محض روح سے مراد وہ چیز ہے جو انسان کے وجود میں غموں کی تکلیف اور خوشیوں کی لذت محسوس کرتی ہے۔ یعنی انسان کی اصل حقیقت جو اس کا نفس اور روح ہے وہ بدستور موجود رہتی ہے۔''

امام صاحبؒ کے بیان کیے ہوئے ان حقائق کا ثبوت قرآن حکیم کی آیات اور احادیثِ نبویؐ سے بھی ملتا ہے کہ موت مرجانے یا روح کے ادراک کا فنا ہو جانا نہیں ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝۱۶۹﴾ (آل عمران)

''اور (اے پیغمبر!) جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہوئے ہیں انہیں آپ ہرگز مردہ نہ

سمجھنا' بلکہ وہ زندہ ہیں' انہیں اپنے ربّ کے پاس سے رزق ملتا ہے۔''

اس سے قبل سورۃ البقرہ میں یہی بات ان الفاظ میں بیان کی جا چکی ہے کہ:

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝۱۵۴﴾

''اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل ہو جائیں ان کو مردہ مت کہو۔ دراصل وہ زندہ ہیں' مگر تمہیں (ان کی زندگی کا) احساس نہیں ہوتا۔''

چنانچہ موت اگر زندگی کا خاتمہ ہوتی تو حشر نشر اور جزاء وسزا کا تصور ہی ختم ہو جاتا۔ جب زندگی ہی نہ رہی تو پھر محاسبہ کس سے ہوگا؟ دراصل انسان کی حیاتِ دُنیوی اور موت کے درمیان ایک مختصر سے وقفہ کو زندگی کا نام دیا گیا ہے۔ اور یہی وہ وقفہ ہے جس میں انسانوں کے اعمال کے اچھے یا برے نتائج بعث بعد الموت ظاہر ہوں گے۔ بفحوائے قرآنی:

﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ﴾ (الملک:۲)

''وہی ہے جس نے موت وحیات کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔''

خالق کائنات کا سب سے دلآویز اور بہترین شاہکار انسان ہے۔ خالق نے اسے تخلیق کیا' اس کی صورت گری کی اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو سجدہ کرو۔

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝۲۸ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝۲۹﴾

''اور جب کہا تمہارے رب نے فرشتوں سے کہ میں گارے کی کھنکناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ لہٰذا جب میں اس کو پوری طرح بنالوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔''

اس ایک سجدے نے خاک کے پُتلے کو رفعت شان عطا کر دی' جبکہ اسی ایک سجدے کے انکار نے ابلیس کو اس دنیا کی بساط لپیٹے جانے تک مردود قرار دے دیا۔ اس کے بعد بھی رحمت خداوندی کے جوشِ محبت میں کمی نہ آئی۔۔ چنانچہ اسی مسجودِ ملائک کو سننے' دیکھنے اور بولنے کی اعلیٰ صفات سے سرفراز کیا۔ تجسّس' تفکّر اور تعقّل کی صلاحیتوں سے نوازا۔ ارادہ و اختیار کی آزادی دی۔ ہوا' پانی' حرارت کی مادی ضروریات مہیا کیں۔ موسمی تغیرات سے مقابلہ کرنے کی استعداد وقوت اور فہم عطا فرمایا۔ اور ان سب پر مستزاد ہدایتِ ربانی سے سرفراز کیا' جو خالق ومخلوق کے رشتے کو مضبوط و مستحکم کرتی ہے۔ ہدایتِ ربانی کا یہ چشمہ صافی ہر طالبِ ہدایت کے

لیے جاری وساری ہے۔ جو چاہے اپنے قلب ونظر کی بنجر زمین کو سیراب کر سکتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۸﴾ (البقرۃ)

''پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے' تو جو کوئی میری اس ہدایت کی اتباع کرے گا' انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

ان تمام انعام واکرام کا تقاضا یہ ہے کہ مخلوق خالق کی منشاء ومرضی کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔ اس کی حیاتِ دنیوی کا ہر لمحہ' ہر لحظہ اور ہر آن خالق کی اطاعت وفرمانبرداری میں بسر ہو۔ بقول اقبال:۔

ہر لحظہ ہے مؤمن کی نئی شان نئی آن
کردار میں گفتار میں اللہ کی برہان

خلق اور امر کا تعلق وہ ہی ہے جو روح اور بدن کا ہے۔ روح نکل جائے تو بدن مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے اور اگر جلدی اس مٹی کو خاکِ زمین میں نہ ملا دیا جائے تو تعفّن پھیلتا ہے اور فضا ناخوشگوار اور ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ خالق اور مخلوق کا تعلق کمزور تب ہوتا ہے جب درمیان میں کچھ اور آلہہ در آتے ہیں۔ یہ انسان کے ذہن کے تراشے ہوئے آلہہ اپنے جیسے انسانوں کی صورت میں بھی ہو سکتے ہیں اور اپنے نفس کے تقاضوں کی شکل میں بھی۔ انسانوں اور اپنے سرکش نفس کے معبودانِ باطل کی اتباع و پیروی کر کے انسان خود ہی اپنے گلے میں غلامی کے طوق ڈال لیتا ہے' اور اسی مقام سے فتنہ وفساد کی شروعات ہوتی ہیں۔ انسان کی فکری اور عملی گمراہی سے بچنے کا واحد حل اس ہدایت ربانی پر عمل ہے جس کے بارے میں انسان کو عالمِ امر سے عالمِ خلق کی جانب روانگی کے وقت ہی آگاہ کر دیا گیا تھا۔

حیات بعد الموت اصل اور حقیقی زندگی ہے جس سے کسی جن و بشر کو فرار حاصل نہیں۔ فرمانِ خداوندی ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۱۸۵﴾ (اٰل عمران)

''ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے' اور تم سب کو تمہارے (اعمال کے) پورے پورے بدلے ملیں گے۔ پھر جس کسی کو دوزخ سے دور ہٹا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا' وہ صحیح معنی میں کامیاب ہو گیا' اور یہ دنیوی زندگی تو (جنت کے مقابلے میں) دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم اپنے مضمون ''حقیقتِ روح و نفس'' میں قرآن حکیم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''نفسِ انسانی کے قرآن کریم میں تین مراتب بیان ہوئے ہیں۔ ہر مرتبہ کے اعتبار سے اس کے مختلف نام مقرر کیے ہیں' نفس انسانی تین نہیں ایک ہی ہے۔ جس طرح نفس نباتی نفس حیوانی بنا' اسی طرح نفس حیوانی نفس انسانی بنا۔ اب نفس انسانی کے تین مراتب ہیں نہ کہ انواعِ متضاد۔ مثلاً سورۂ یوسف (آیت ۵۳) میں فرمایا: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾۔ یہ نفس امارہ کا بیان ہوا۔ سورۃ القیامہ کی (آیت ۲) میں فرمایا: ﴿لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲﴾ یہ نفس لوامہ کا بیان ہوا اور اسی طرح سورہ الفجر میں فرمایا: ﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝۲۷ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝۲۸﴾ یہ نفسِ مطمئنہ کا بیان ہوا۔''

یہ نفس کیا ہے؟ یہی اصل جوہرِ حیات ہے۔ یہ حیات کا وہ جوہر ہی ہے جس میں عقل و شعور' فہم و ادراک اور بصیرت و ژرف نگاہی کی استعدادات مضمر ہیں۔ یہ نفس ہی انسان کے تہذیب و تمدن کی آبیاری میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نفسِ امارہ سے نفسِ مطمئنہ تک کا کٹھن سفر اسی جوہرِ حیات کے شفاف (transparent) ہونے پر منحصر ہے۔ نفسِ مطمئنہ اور نفس امارہ کے بیچ جو نفسِ لوّامہ ہے وہ ان دونوں نفسوں کی رسّہ کشی کا شکار رہتا ہے۔ انسان کی فکری و عملی گمراہیوں' بداعمالیوں اور فسق و فجور کی کششِ ثقل کبھی امارہ کی طرف کھینچتی ہے تو کبھی انسان کی فکری شفافیت اور اس کی قوتِ ایمانی کا ترفّع اسے نفسِ مطمئنہ کے نزدیک لے جاتا ہے۔ بقول غالب ؎

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

انسان اپنی ریاضتِ عملی' مجاہدے' زہد و ورع' بے ریا اطاعتِ ربّ اور صحبتِ صالح کے زیر اثر جب نفس مطمئنہ کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے تو پھر نفس امارہ اپنے تمام سفلی میلانات اور خُبثِ باطن کی سرکشی کے ساتھ اس طرح شکست خوردہ ہو کر پیچھے ہٹتا ہے' جیسے صبح کا اجالا پھیلنے

کے بعد رات کا گھمبیر اندھیرا خود اپنی تیرگی کے وجود میں سمٹ کر فنا ہو جاتا ہے۔ نفسِ ثلاثہ کی یہ جنگ ہی دراصل خیر و شر کی وہ جنگ ہے جس کا مادہ انسان کے خمیر میں اس کی تخلیق کے وقت ہی اس کے خالق و مالک نے رکھ دیا تھا۔

موت انسان کو مکمل طور پر وصول کر کے عالم برزخ کی ان وادیوں میں پہنچا دیتی ہے جہاں انسان اپنی حیاتِ دنیوی کی جولان گاہ میں گزارے ہوئے روز و شب کے اعمال کے جاں گسل اور لرزا دینے والے انجام سے دوچار ہونے یا تقویٰ کی دشوار گزار گھاٹیوں میں بسر کیے ہوئے لمحات کے عوض فرحت و انبساط کی جنت میں داخلے کے انتظار میں اس دوسری زندگی میں منتظرِ فردا رہے گا' جس کا فیصلہ حشر کے میدان میں ہوگا' اور اُس دن ہر انسان کی حالتِ زار از روئے قرآن حکیم کچھ یوں ہوگی:

﴿يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝۱۳ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝۱۵﴾ (القیامۃ)

''اُس دن ہر ایک انسان کو جتلا دیا جائے گا کہ اس نے کیا کچھ آگے بھیجا ہے اور کیا کچھ پیچھے چھوڑا ہے۔ بلکہ انسان خود اپنے آپ سے اچھی طرح واقف ہوگا' چاہے وہ کتنے بہانے بنائے۔''

برزخ کی زندگی کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے:

''جب تم میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کا ٹھکانہ صبح و شام اس پر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر وہ دوزخی ہوگا تو دوزخ میں اور اگر جنتی ہوگا تو جنت میں اس کا ٹھکانہ دکھلا دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ تیرا اصل ٹھکانہ ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تجھ کو اس میں قیامت کے دن پہنچا دے گا۔ اور جو کچھ ان ٹھکانوں کو دیکھنے سے لذت یا عذاب اس وقت ہوگا وہ کسی سے مخفی نہیں۔'' (عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رواہ البخاری و مسلم)

برزخی زندگی کی اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان کی حیاتِ دُنیوی میں جو تکالیف اور مصائب اس کو پہنچتے ہیں اس کا براہ راست اثر اس کے جسمانی وجود پر ہوتا ہے' جبکہ روح کو تبعاً اذیت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس حیاتِ برزخی میں انسان کی روح ہر قسم کے مصائب و آلام سے دوچار ہوتی ہے اور اس کا خاکی الاصل جسم تبعاً اثر قبول کرتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی روح و بدن کا ایک لطیف سا تعلق آپس میں قائم رہتا ہے۔

اس دنیا میں انسان کی ایک اور آزمائش نسیان کا وہ مادہ ہے جو تخلیق آدم کے وقت ہی اس

کے اندر رکھ دیا گیا تھا' اور اسی کے نتیجے میں 'عہد الست' کا وہ واقعہ انسانی ذہن سے محو ہو جاتا ہے جب خالقِ جن و بشر نے لشکرِ ارواح سے اقرر کروایا تھا۔

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴾

''اور (اے رسولؐ! لوگوں کو وہ وقت یاد دلاؤ) جب تمہارے پروردگار نے آدم کے بیٹوں کی پشت سے ان کی ساری اولاد کو نکالا تھا اور ان کو خود اپنے اوپر گواہ بنایا تھا (اور پوچھا تھا کہ) کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا: کیوں نہیں؟ ہم سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔ (اور یہ اقرار ہم نے اس لیے لیا تھا) تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔''

انسان اس عہد میں جکڑے جانے کے بعد اب مسئولیت کی اس صلیب پر لٹکا ہوا ہے جس سے چھٹکارا پانا ممکن ہی نہیں۔ نسیان کے اثر سے اس عہد کو بھول جانے کے تدارک کے لیے ہی انسان کو سمع و بصر اور عقل و شعور کی قوتوں سے بہرہ مند کرنے کے بعد انبیاء و رسل علیہم السلام کا ایک طویل سلسلہ بھی دراز کر دیا گیا تاکہ ہر انسان کو بھولا ہوا سبق یاد ہوتا رہے اور تذکیر و یاددہانی کا عمل جاری رہے۔ اب یہ انسان کے اپنے فکر و عمل اور عقیدے کی راستی یا کجروی پر منحصر ہے کہ وہ اس تذکیر کے ذریعے خود کو ایک بندہ مؤمن ثابت کرتا ہے یا نافرمان و ناسپاس انسان کا رنگ اختیار کر کے زندگی گزارتا ہے۔ جبکہ نیکی اور بدی کے دونوں راستے اس کے سامنے واضح کر دیے گئے ہیں۔

ایک بندہ مؤمن اللہ کی محبت' عبادت و پرستش اور اپنے حسن عمل سے خود کو اس درجہ کمال تک پہنچا دیتا ہے جو اللہ کو اصلاً مطلوب ہے تو وہ مقامِ ولایت پر جا پہنچتا ہے اور پھر اس بندۂ محبوب کے لیے زمان و مقام کی قیود بے معنی ہو جاتی ہیں اور وہ قاب قوسین کی منزل پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسی درجہ کو احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے' اور اللہ اس درجہ احسان کو پسند فرماتا ہے۔ حدیث مبارکہ میں اس مقام کی وضاحت کچھ یوں کی گئی ہے:

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ، فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) (مسلم)

''(احسان یہ ہے) کہ تم اللہ کی عبادت و بندگی اس طرح کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے

ہو' اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھتا ہی ہے۔''

موت و حیات کے مابین دیے گئے زندگی کے اس وقفے میں یہی امتحان لینا مطلوب ہے کہ عبادت میں' معاملات میں' محبت میں' عداوت میں' عدل و انصاف میں اور اس فانی زندگی میں کیے گئے دیگر اعمال میں للّٰہیت' خوفِ خدا' محبتِ خدا' عقیدۂ توحید کی پختگی اور آخرت کی جواب دہی کا واضح تصور' اس دنیا کی بے ثباتی اور متاع الغرور ہونے کی کیفیت کے شعوری ادراک کے پیمانے کیا ہیں؟ زندگی میں ہماری ہر حرکت و سکون کا اصل منبع و محور کون ہے؟ وہ ذاتِ الٰہی جو کل عالم کون و مکاں کا مرجع و منبع ہے یا اس دنیا کی عارضی اور فنا کے گھاٹ اتر جانے والی چند روزہ مادی زندگی؟ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے احسان کی اس کیفیت میں بسر کی ہوئی زندگی کو ایک طرح کی حیاتِ جاوداں سے تعبیر کیا ہے:

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے!

موت زندگی کے تعاقب میں ہے۔ انسان خلا کی بسیط پہنائیوں میں ہو' سطح زمین پر یا تحت الثریٰ میں' موت اپنے وقت پر ہر انسان کو اس کے مقام اور ٹھکانے پر آدبوچے گی۔ اس سے کسی نوع بشر کو رستگاری نہیں۔ موت کے ڈر سے بھاگنا فضول ہے' اس کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ایمان و یقین کی پختگی کی علامت ہے۔ بقولِ اقبال:

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

ایمان کامل' عمل صالح' حق کی نشر و اشاعت اور اس کٹھن راہ میں آنے والے پیچ و خم اور صعوبتوں پر صبرِ مسلسل موت کا مقابلہ کرنے کے لیے مؤمن کے ہتھیار ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''تمام انسان خطاکار ہیں' مگر بہترین خطاکار وہ ہیں جو توبہ کرتے ہیں۔ اپنی کوتاہیوں' تقصیروں اور نادانیوں پر نادم ہوتے ہیں۔''

چنانچہ اللہ کی ذاتِ کریمی کے سامنے ندامت کے آنسو بہاتے رہنا بندگی اور تذلّل کا اظہار ہے۔ اور نہ جانے کون سا آنسو ربّ کریم کو پسند آجائے اور وہ ایک ہی آنسو نجات کا بہت بڑا ذریعہ بن جائے۔ بقول علامہ اقبال:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

انسان کمزور ہے، نحیف ہے ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا﴾۔اس بشری کمزوری کی بنا پر کبھی توبہ ٹوٹ جائے تو جی چھوڑ دینا مؤمن کی شان نہیں۔تجدیدِ توبہ کرتے رہنا اللہ کی کبریائی کے سامنے سرِتسلیم خم کر دینے کے مترادف ہے۔

توبہ مری جام شکن ، جام مرا توبہ شکن
سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا!

اپنی ذات کی گہرائیوں سے واقفیت اور اپنی فکری و عملی کوتاہیوں اور خامیوں کا صحیح ادراک اور اس پر شرمساری نجاتِ اُخروی کے جانب امید افزا اقدم ہے۔خود فریبی کا دھواں اپنی ذات میں جھانکنے نہیں دیتا لیکن ''لطافت بے کثافت جلوہ آرا ہو نہیں سکتی''۔اپنی ذات اور اپنے باطن کی کیفیت کے شعوری ادراک کا دوسرا نام تحلیلِ نفسی (phychoanalysis) ہے۔قرآن حکیم کے سرچشمہ رُشد و ہدایت میں روشنی حاصل کرنے سے انسان کے قلب و ذہن کی بند پرتیں کھلتی جاتی ہیں، اور کسی مقام پر انسان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ زیرِ مطالعہ آیت میں تو میرا ہی تذکرہ ہے۔قرآن بھی تو یہی کہتا ہے کہ: ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ کِتَابًا فِیْهِ ذِکْرُکُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۱۰﴾ ''بیشک ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے۔تو کیا تم سمجھتے نہیں؟'' اس سے بڑھ کر انسان کی کرداریت اور فکر و نظر کی تحلیل نفسی اور کیا ہوگی؟ قرآن کا تو موضوع ہی انسان ہے۔پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی موت و حیات کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے قرآن خاموش رہے۔یہ دنیوی زندگی امتحان کا دورانیہ ہے، جس کا نتیجہ آخرت کی حشر سامانیوں میں نکلے گا۔اور وہ ہوگا ہمیشہ کی فلاح یا ہمیشہ کا خسران اور پچھتاوا۔ بس یہی موت و حیات کا اصل فلسفہ ہے۔

raheelgoher5@gmail.com

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

خواتین کا عالمی دن

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

خواتین کے عالمی دن کے موقع پر تمام مہذّب اور غیر مہذّب دنیا کے مرد وزن اپنی اپنی رائے بیان کرتے ہیں اور اس دن خواتین کے حقوق کے بارے میں لمبے لمبے مقالات پڑھے جاتے ہیں۔ ان مقالات سے واضح ہوتا ہے کہ عورت ہر جگہ مرد کے ظلم وستم کا نشانہ بنتی ہے۔ بیوی ہو یا بہن اور بیٹی‘ گھریلو خاتون ہو یا ملازمت پیشہ‘ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گھر سے باہر اور گھر کے اندر مَردوں کی شکل میں بھیڑیے اور درندے پھر رہے ہیں جو عورت کو کسی حال میں چین نہیں لینے دیتے—— اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر ہم دیانت دارانہ جائزہ لیں تو غیر مسلم اور مسلمان خواتین کے احوال میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ فرق صرف معاشی اور معاشرتی ترقی کا نظر آتا ہے‘ بایں طور کہ مغرب اور غیر مسلم ممالک میں صحت‘ تعلیم اور دوسری بنیادی ضروریات کا معیار ہر شہری کے لیے یکساں ہے۔ باقی ہدایت سے بے بہرہ ہونے کے باعث عورت کے حقوق وہاں بھی پامال ہو رہے ہیں‘ اور مسلمان ممالک میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یا تو اسلام نے اپنے پیروکاروں کو معاشرتی مسائل کا حل ہی نہیں بتایا یا زوال کی انتہا یہ ہے کہ مسلمان ان بنیادی تعلیمات اور اخلاقیات سے بے بہرہ ہیں۔

ذیل میں عورت کے مختلف پہلوؤں (ماں‘ بیوی‘ بیٹی‘ بہن وغیرہ) پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور فتنہ وفساد کی اصل وجہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس نازک معاشرتی مسئلے پر ہدایت عطا فرمائے۔ (آمین!)

سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں بٹھا لینی چاہیے کہ مرد وزن کے درمیان افراط وتفریط کے یہ دھکے اور عورت کے ساتھ ناروا سلوک‘ انسانی زندگی کے آغاز سے ہی ہوتا آ رہا ہے۔ فرق محض قدیم اور جدید کا ہے۔ پہلے جہالت‘ لاعلمی اور عورت کو کمزور سمجھنے کی وجہ سے یہ ہوتا رہا اور اب علم‘ مساواتِ مَرد وزن اور آزادیٔ نسواں نیز مادر پدر آزادی کے نام پر یہ سب ہو رہا ہے۔ قوتِ محرکہ ہر دَور میں ایک ہی رہی ہے اور وہ ہے جنسی تعلقات کا مطالبہ اور اس کی تکمیل کی

خواہش۔ جدید جہالت کے دَور میں اسے آپ freedom of sex کہہ لیں‘ یا یہ کہ ہم جنس پرستی سمیت‘ اس معاملے میں ہر قسم کی لذات کا آزادانہ اور کھلم کھلا استعمال—— اب اس کی وضاحت کی طرف آتے ہیں:

سیکس کا جذبہ اللہ نے محض مرد میں ہی نہیں بلکہ عورت میں بھی رکھا ہے اور اضافی طور پر عورت کے اندر خودنمائی کا جذبہ بھی رکھ دیا گیا۔ وہ سراہے جانا پسند کرتی ہے اور خود کو بنانا اور سنوارنا بھی‘ لیکن ساتھ ہی عورت کی فطرت میں شرم وحیا رکھ دی گئی ہے جو اپنے جبلی تقاضے (sex) کے کھلم کھلا اظہار سے عورت کو باز رکھتی ہے۔ دوسری طرف مرد کے اندر اقدام کا جذبہ رکھا گیا ہے اور اِظہار کو اس عمل کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ مرد کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے‘ لہٰذا جنس مخالف کی کشش میں اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وہ جائز ہو یا ناجائز‘ موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بلّی گوشت اور دودھ کی تلاش میں رہتی ہے تو ان چیزوں کو بلی سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ گوشت کھلا رکھ دیا جائے اور بلی کو منہ مارنے سے روکا جائے۔ چنانچہ جس ذاتِ باری تعالیٰ نے یہ احساسات مرد وعورت میں ڈال کر ان کو تخلیق کیا وہ ذات باخبر ہے کہ ان جذبات واحساسات کو کہاں روکنا ہے اور کہاں استعمال کرنا ہے۔ لہٰذا اس نے کچھ حدود وقیود رکھ دی ہیں تاکہ وہ مرد وزن جو اللہ کی ربوبیت کو تسلیم کر چکے ہیں‘ ان حدود کی پابندی کر کے خود کو حیوانی سطح سے بلند کر لیں۔ ان فرمودات اور احکامات کی پابندی میں انسان کی عزت اور اس کا شرف پوشیدہ ہے۔

حیوانی سطح پر اگر ہم جنسی جذبے کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ فرق انسان کے اشرف المخلوقات ہونے اور جانور کے محض جانور ہونے میں ہے‘ وگرنہ یہ جذبہ تقریباً یکساں ہے۔ گھوڑے کھیلوں میں استعمال ہوتے ہیں‘ خصوصاً پولو (Polo) جیسے کھیل میں—— اور مشہور ہے کہ پولو کے میدان یا گھڑ دوڑ میں ایسے گھوڑے استعمال ہوتے ہیں جو خوب چاک و چوبند‘ سدھائے ہوئے اور اپنے مالک کے وفادار ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں میدان میں ان کے سامنے گھوڑی آ جائے تو بدک جاتے ہیں‘ لہٰذا ایسے مقامات سے گھوڑیوں کو دور رکھا جاتا ہے تاکہ گھوڑے اپنے مقصد سے ہٹ نہ جائیں اور کامیاب ہو سکیں۔

اس مثال سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس منہ زور اور طاقتور جذبے کو نہایت حکمت اور دو طرفہ حفاظت سے قابو کیا جائے تو معاملات بگڑنے نہیں پاتے۔ جبکہ یہاں المیہ یہ ہے کہ عورت کی لگام مرد کے اختیار سے باہر ہے۔ مرد قوام ہے‘ مگر جانتا نہیں ہے کہ عورت کس رویے‘ سلوک اور اندازِ فکر کی مستحق ہے۔ جب تک کاروبارِ زندگی‘ تعلیم وتعلّم اور

معاشی میدان میں عورت مرد کے شانہ بشانہ مخلوط حیثیت میں موجود ہے' مرد کامیاب نہیں ہوسکتا۔عورتیں بے پناہ صلاحیتیں رکھتی ہیں اور ذہانت اور استعداد کے اظہار کے ساتھ ساتھ خود نمائی کے جذبے کی خاطر خواہ تسکین آفس' سکول' کالج' یونیورسٹی اور دیگر شعبہ ہائے زندگی میں مَردوں کے درمیان کام کرنے سے ہو جاتی ہے' لہٰذا وہ ہر جگہ اپنا لوہا منواتی ہیں۔آج کل تعلیمی اداروں کے رزلٹ ہی اٹھا کر دیکھ لیں۔شرم سے سر جھک جاتا ہے کہ یہ ہیں ہمارے قوّام!!!

اپنے کام کرنے کی جگہ پر لڑکیوں اور خواتین کی موجودگی ہمارے لڑکوں اور مَردوں کو حواس باختہ کیے رکھتی ہے۔ساری توجہ بننے سنورنے' تانک جھانک کرنے اور صنفِ مخالف کی توجہ حاصل کرنے تک محدود ہو جاتی ہے۔یہ تو گھر سے باہر کی بات ہے' گھر کے اندر بھی مائیں' بہنیں' بیٹیاں اپنے مَردوں کے لیے فتنہ ہیں' بفحوائے حدیث ''میں اپنے پیچھے عورتوں سے بڑھ کر مَردوں کے لیے کوئی فتنہ نہیں چھوڑے جا رہا''۔جن اعضاء کو اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے چھپانے کا حکم دیا ہے ان کو میڈیا کے ذریعے ہر گھر میں عورت کھول کر دکھاتی ہے۔دوپٹوں کا کوئی ہوش نہیں۔ہر عورت دعوتِ نظارہ دے رہی ہے اور ہر مرد کی آنکھیں' کان' ناک اور ہاتھ پاؤں زنا کر رہے ہیں۔مغرب کی کافر عورت تو ایک طرف رہ گئی' ہماری مسلمان مائیں' بہنیں' بیٹیاں' فیشن کے نام پر جو کچھ کر رہی ہیں اس کے بعد اگر وہ معاشرے کے بھوکے بھیڑیوں کی درندگی کا نشانہ بنتی ہیں تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔سیکس جتنا منہ زور جذبہ ہے اس کے کنٹرول کے احکامات بھی اتنے ہی سخت ہیں۔آپ ان احکامات کے نفاذ کے معاملے میں ذرا سی نرمی دکھائیں گے تو نفس کا منہ زور گھوڑا اپنی من مانی کرے گا اور وہی حالات پیدا ہوں گے جو آج کل ہیں۔

آیئے ذرا ماضی میں جھانکیں' محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے کی غیر مہذب دنیا میں کیا ہو رہا تھا؟ دیگر بہت سی برائیوں کے ساتھ ساتھ عورت اور مرد کے رشتے کی پامالی عام تھی۔ مرد لاتعداد بیویاں رکھتا تھا' یہاں تک کہ سوتیلی ماؤں کو بھی حرم میں داخل کر لیتا تھا۔عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور وہ باعث ذلت یوں تھی کہ باعزت باپ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی اسے زندہ درگور کر دیتا تھا۔اسلام نے عورت کو بہترین مقام عطا کیا:

(۱) ماں' بہن' بیٹی اور بیوی کے رتبوں کو معتبر کر کے۔

(۲) ستر و حجاب اور شرم و حیا کے ذریعے اسے قیمتی موتی کی طرح چھپا دیا۔

ان دونوں باتوں کو یکجا کیا جائے تو عورت کے لیے عزت و احترام اور پاکیزگی کے

جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اگر شرم و حیا کو اتار کر رکھ دیا جائے تو عورت آج بھی اتنی ہی ذلیل ہے جتنی کل تھی۔ پہلے اگر عورت پاؤں کی جوتی تھی تو آج اکیسویں صدی میں عورت اور جوتی کی تصویر ایک ساتھ چھپتی ہے۔ پہلے وہ پیدا ہوتے ہی ماردی جاتی تھی' جبکہ آج بڑے بڑے بل بورڈز کی صورت میں شہر کے ہر چھوٹے بڑے چوک میں اس کی عزت اور اس کا شرف سولی پر لٹکا دیا جاتا ہے اور عورت کی روح سسکے بغیر دم توڑ دیتی ہے جبکہ اسے اس کا احساس تک نہیں۔ یہ ہے عورت کی پامالی اور ظلم کی انتہا!! اور ستم ظریفی یہ کہ وہ اس پر شاداں و فرحاں ہے۔آج عورت مار پیٹ' طلاق' بے عزتی اور بے حرمتی کا شکار ہے۔ یہ وہ سزا ہے جو اپنا اصل مقام فراموش کرنے کی وجہ سے اللہ نے اس پر مسلط کی ہے اور پھر بھی وہ خود کو مظلوم کہتی ہے۔

ذیل میں اس کو واضح کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا اور عورت کس طرح قصوروار ہے! اور کہاں مظلوم ہے!

عورت' بحیثیت ماں

دنیا کے ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض اور ذمہ داریوں کے ساتھ دنیا میں بھیجا ہے۔ یہ فرائض دوسروں کے حقوق ہیں۔حقوق کی دو شاخیں ہیں: (۱) حقوق اللہ اور (۲) حقوق العباد۔ ہر شخص اگر اپنے فرائض بحسن و خوبی ادا کرے تو ہر شخص کو حقوق ملیں گے اور معاشرہ امن کا گہوارہ ہوگا' ورنہ فساد ہوگا۔

از روئے قرآن و حدیث ماں اپنے بچوں کی راعیہ ہے اور اس نگرانی و ذمہ داری کی بابت وہ عنداللہ مسئول ہے۔اولاد کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بارے میں سکھانا اور ان کی ادائیگی کی تربیت دینا' نیز اپنی اولاد کو بہترین مسلمان بننے کے گر سکھانا' اس کی دینی و دنیوی تعلیم و تربیت' اخلاق و آداب کی تعلیم' دنیا میں رضائے الٰہی کے حصول کی کوشش اور آخرت کی کامیابی کا سودا بچوں کے دماغ میں سمانا' یہ سب ماں کی ذمہ داریاں ہیں۔ حدیث رسولؐ کا مفہوم ہے کہ اولاد کی پہلی درسگاہ ماں کی گود ہے۔اسلام نے ہمیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سمیت بے شمار جلیل القدر ماؤں (حضرت اسماء' حضرت خنساء و دیگر صحابیات رضی اللہ عنہن) کا اُسوہ دیا ہے جنہوں نے چکیاں پیسیں' مشکیزے بھرے اور قرآن و حدیث کی گھٹی اپنی اولاد کو دی۔ ہم نہایت فخر سے ان جلیل القدر صحابہ و صحابیات کا نام لیتے ہیں' مگر ان کے اُسوہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں' بایں طور کہ

(۱) ہماری آج کے دور کی ماں جب خود نماز و قرآن پڑھنے اور سیکھنے کے لیے بڑھاپے کا

انتظار کرے گی تو اولاد حقوق اللہ کہاں سے سیکھے گی؟؟

(۲) مادہ پرستی کی دوڑ میں آگے سے آگے نکلنا' بہترین گھر' گاڑی' لباس اور نوکر چاکر کی تمنا' سٹیٹس کی دوڑ میں حلال وحرام کو بھلا دینا آج کی ماؤں کا شیوہ ہے۔ اولاد حرام پر پلی ہو تو اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کیسے کرے گی؟؟

(۳) شرم وحیا اور ستر وحجاب کی پابندی جب ماں نہیں کرے گی تو بیٹیاں باحیا کیسے رہیں گی؟ بیٹیوں کی نظریں کیسے جھکی رہیں گی؟ مخلوط تعلیمی اداروں میں بیٹیوں کو بھیج کر سکون سے سونے والی مائیں کل کو بیٹیوں اور بیٹوں کے گمراہ ہونے کا شکوہ کیسے کر سکتی ہیں جبکہ قصور خود ماؤں کا ہے!

اولاد کے اندر فیشن پرستی ڈالنا اور فیشن بھی وہ جو اخلاق باختہ ہو' محض مادی تعلیم کے لیے اونچے سکولوں میں بھیجنا' رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی بجائے بڑے بڑے سکولوں میں مغربی تہذیب کے نمونے تیار کرانا' یہ سب وہ اقدامات ہیں جن کی وجہ سے آج کی اولاد والدین کی عزت' احترام' فرمانبرداری' اخلاق وآداب اور تقویٰ سے عاری ہو چکی ہے۔ لہٰذا آج کی ماں اپنی ذمہ داری میں بری طرح فیل ہو چکی ہے۔ نتیجتاً معاشرہ محض جانوروں پر مشتمل ہے۔

ہوسکتا ہے بہت سی مائیں میرے ان الفاظ پر احتجاج کریں کہ سارا قصور ہمارا کیسے ہے؟ اور یہی تو وہ نکتہ ہے جسے عورت فراموش کر گئی ہے۔ معاشرے کا سب سے اہم کردار تو عورت ہی ہے اور عورت یہ کہتی ہے کہ اسلام ہمیں حقوق نہیں دیتا!! اگر عورت نے اپنا فرض نبھایا ہوتا' اپنا مقام یاد رکھا ہوتا تو آج دنیا کی سب سے معتبر اور باعث احترام ہستی عورت ہی ہوتی اور یہ نہ کہتی پھرتی کہ میں مظلوم ہوں۔

یہاں تذکرہ عورت کا بحیثیت ساس ہو جائے۔ جب ایک ماں ساس بن کر بہو پر ناروا مظالم ڈھائے گی تو بہو اس کی ذرا بھی عزت نہیں کرے گی اور وقت آنے پر جب ساس بڑھاپے میں اپنے ساتھ حسن سلوک چاہے گی تو بہو کو ساس کی زیادتیاں یاد آئیں گی۔ پھر ساس کہتی ہے کہ میں مظلوم ہوں' حالانکہ اصول یہی ہے کہ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ جب ماں جوان ہوتی ہے تو زیب وزینت اور دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر اولاد کو فراموش کر بیٹھتی ہے۔ کیبل دیکھنے' پارلر کے چکر لگانے اور سہیلیوں کے ساتھ گپ شپ میں کام والیاں رکھنے کے باوجود وقت میں برکت نہیں رہتی۔ گھر میں موجود بوڑھے ساس سسر' شوہر اور بچوں کو فراموش کیے جب ماں خود بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھتی ہے تو ماضی میں اندھیرا نظر آتا ہے اور حال یہ بتاتا

ہے کہ کل اپنے فرائض ادا کیے ہوتے تو اولاد آج فرمانبردار ہوتی۔ مستقبل پر نظر ڈالتی ہے تو مایوسی ہوتی ہے اور موت قریب نظر آنے لگتی ہے جس کے لیے کوئی تیاری نہیں کی ہوتی۔ ساری عمر مغرب کے اصولوں پر چلنے والی ماں کو جب ان کے مغربی سکولوں کے پروردہ بچے تنہا چھوڑ دیتے ہیں تو ماں کہتی ہے میں مظلوم ہوں۔ ہمارے لیے مغرب کے اصول قابل عمل نہیں ہیں۔ مسلمان ماں محض دنیا کے لیے نہیں بلکہ دراصل آخرت کے لیے اپنی اولاد کو تیار کرتی ہے' کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اولاد یونہی نہیں مل گئی بلکہ اللہ کے پاس جا کر اس کی تربیت کا حساب بھی دینا ہے۔ عورت کا دائرہ کار' اس کا میدانِ جہاد' اس کے شوہر کا گھر اور اس کے بچے ہیں۔ اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے ادا کرے گی تو نہ صرف دنیا میں اچھا صلہ پائے گی بلکہ قیامت کے دن وہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو سکتی ہے۔ سبحان اللہ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُنَّ (آمین!)

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اپنی کتاب ''مسلمان عورت'' میں فرماتے ہیں کہ ''عورت کا طبعی فرض نوعِ انسانی کی حفاظت اور تربیت ہے۔ اس دائرے سے عورت جب قدم باہر نکالتی ہے تو عورت نہیں رہتی بلکہ عورت اور مرد کے علاوہ ایک تیسری جنس کا نمونہ بن جاتی ہے۔''

یہ تو تھا عورت کے بحیثیت ماں فرائض کا جائزہ۔ اب یہ بات تو واضح ہو گئی کہ ع ''جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے'' کے مصداق جب ماں کا رتبہ عظیم ہے تو اس کی ذمہ داری بھی اتنی ہی بھاری ہے۔ اس بھاری راعیہ' مربیہ اور نگران کو رب ذوالجلال نے کیا مقام اور حقوق عطا کیے' ایک نظر اس پر ڈالتے ہیں:

(۱) اللہ نے قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اپنی عبادت کے حکم کے فوراً بعد والدین خصوصاً ماں کے حقوق کا ذکر کیا ہے۔

(۲) ازروئے قرآن ایک مسلمان کے حسنِ سلوک کے سب سے پہلے حق دار اس کے والدین ہیں۔

(۳) اس حسنِ سلوک کے ذیل میں شامل ہے: معروف میں والدین کی اطاعت' ان کے سامنے اُف تک نہ کہنا' ان کو سخت آواز میں نہ جھڑکنا' اور اپنے کندھوں کو عاجزی سے ان کے سامنے جھکا کر رکھنا اور ان کے لیے مسلسل دعا کرتے رہنا: ﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝۲۴﴾ (بنی اسراء یل)

(۴) والدین چاہے مشرک ہوں' اولاد پر معروف میں ان کی اطاعت فرض ہے۔

(۵) نبی اکرم ﷺ نے ماں کو باپ پر تین درجے فوقیت دی ہے۔

(۶) جنت ماؤں کے قدموں تلے رکھ دی گئی۔
(۷) ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ تم پر ماؤں کی نافرمانی حرام کر دی گئی ہے۔
(۸) ایک موقع پر نبی اکرم ﷺ نے اس شخص کے ہلاک ہو جانے کی خبر دی جس کے والدین یا دونوں میں سے ایک بڑھاپے کو پہنچ گئے اور اس نے ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کر لی۔

اولاد کا فرض ہے کہ وہ بڑھاپے میں والدین کی خدمت کرے اور بیوی اور بچوں کی جائز خواہشات سے بڑھ کر والدین کی جائز خواہشات وضروریات کا خیال رکھے۔ زندگی کی مشکلات آسان ہونے اور اخروی کامیابی کے حصول کی راہ میں والدین کی خدمت اور ان کی دعاؤں کا بہت زیادہ عمل دخل ہے' اور والدین دل سے دعا کریں گے جب اولاد اطاعت شعار اور فرمانبردار ہو گی۔ اولاد کی ایسی تربیت ماں باپ خصوصاً ماں کی ذمہ داری ہے۔ آپ اپنی اولاد کو اللہ اور رسولؐ کی فرمانبرداری سکھائیں گے تو اولاد یقیناً اللہ کے دیگر احکامات کے ساتھ ساتھ والدین کے متعلق ارشاداتِ ربانی اور احکاماتِ نبویؐ کو بھی بجالائے گی' ان شاء اللہ!

عورت' بحیثیت بیٹی

کہاوت مشہور ہے: ''پتا پر پُوت پتی پر گھوڑا— بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا'' مزید یہ کہ ''خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے''۔ اولاد زیادہ تر وہی کچھ کرتی ہے جو والدین کو کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ میرا موضوع چونکہ صرف ''خواتین کی مختلف حیثیتیں اور معاشرے میں ان کا مقام'' سے متعلق ہے' لہٰذا یہاں عورت کا بحیثیت ماں' بیٹی اور بیوی جائزہ لیا جا رہا ہے۔ ماں ہر لحاظ سے اپنی اولاد خصوصاً بیٹی کے لیے اُسوۂ ہوتی ہے اور کاغذ کے خالی صفحے کی مانند یا پھر کاربن پیپر کی طرح والدہ کی سوچ' اندازِ گفتگو اور کردار بیٹی کے اندر منتقل ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ جس طرح پچانوے فیصد مائیں خود اپنے طرزِ عمل کی بدولت اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار کر مظلوم کہلواتی ہیں تو ان ماؤں کی بیٹیاں کیسی ہوں گی؟ جبکہ صرف پانچ فیصد مائیں ایسی ہیں جو ایمان' صبر وتحمل' ایثار وقربانی کے ہتھیار سنبھال کر اُمہات المؤمنین' بناتِ رسول اور دیگر صحابیات رضی اللہ عنہن کا نمونہ اپنا کر حالات کا مقابلہ بھی کرتی ہیں اور مصائب وآلام سے تنگ آ کر دنیا کے سامنے مظلوم ہونے کا واویلا بھی نہیں کرتیں۔ یقیناً ان کی اولاد (بیٹے اور بیٹیاں) بھی قابل ستائش ہو گی جو اپنی ماؤں کی بہ نسبت زیادہ بدتر معاشرہ دیکھ رہی ہے اور پھر ہمت وجوانمردی کی مثال بن کر دکھاتی ہے۔ پھر صرف اللہ سے ہی اجر اور انعام

کی طالب ہوتی ہے۔ ایسی بیٹیاں دنیا کی نظروں سے چھپ کر گھر میں رہ کر ایسے چمکتی ہیں جیسے اندھیرے میں چاند! جس کی چمک ہی رات کو نظر آتی ہے' جسے دیکھنے کے لیے بہت کم لوگ ہوتے ہیں لیکن اس کی اہمیت مسلم ہے۔ چاند استعارہ ہے خوبصورتی' ٹھنڈک اور محبت کا اور اس کے ستارے جو اس کے ساتھ محوِ سفر رہتے ہیں اور اندھیروں میں سفر کرنے والوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ذرّے کو اس کا مقام عطا کیا ہے اور ہر مخلوق اپنے مقام میں کمال حاصل کرے تو کامیاب ہے' لیکن سورج رات کو اور چاند صبح کو نکلنے لگے تو نظامِ زندگی درہم برہم ہو جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ (یٰسٓ)

''نہ سورج کے لیے مناسب ہے کہ چاند تک پہنچ جائے اور نہ رات دن سے پہلے آنے کی ہے۔ اور یہ سب اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں۔''

تو اچھی فرمانبردار بچیاں اپنے گھروں میں اپنا کردار بحسن وخوبی نبھاتی ہیں اور زمانے کے سرد وگرم کو گھر میں رہ کر برداشت کرتی ہیں۔ اگر یہ بچیاں دنیا کی نظروں میں آ جائیں تو ان کی چمک ماند پڑ جائے گی۔ جیسے ایک لیڈی پولیس کانسٹیبل جتنی محنت گھر سے باہر نکل کر کرتی ہے' سینکڑوں مردوں کے ساتھ بحث ومباحثہ کرنا' کڑی دھوپ میں باہر رہنا' اس سے اس کی ساری نسوانیت اور وقار ختم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اس سے آدھی محنت گھر میں کرے تو وہ نہایت پرسکون اور کامیاب زندگی گزار سکتی ہے۔ ایک ایئر ہوسٹس ہزاروں نامحرم مَردوں کے سامنے جس دلربا مسکراہٹ کے ساتھ ان کی ضروریات پوری کرتی ہے' کیا یہ دلربا مسکراہٹ کے ساتھ ماں باپ' بہن بھائیوں اور شوہر کی خدمت نہیں کر سکتی؟ ایک لیڈی ٹیچر سارا دن تیس چالیس مختلف مزاج کے بچوں کے ساتھ سر کھپا سکتی ہے' اگر اس کا بیس فیصد وقت اور توانائی اپنے بچوں کو دے تو نسلیں سنور جائیں۔ لہٰذا اپنے گھر میں چاہے دال روٹی' چٹنی اور پیاز ہی کھانی پڑے' گھر کی چار دیواری میں رہ کر اپنے فرائض ادا کرنا ایک مسلمان عورت کو زیب دیتا ہے۔ اس کا شرف اور اس کی عزت اسی میں ہے ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تُو کر لے!!

کے مصداق اپنا آپ منوانے کے لیے عورت کو گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے

برعکس جب عورت گھر سے باہر نکلتی ہے تو صرف ملازمت یا پڑھائی کے چکر میں نہیں بلکہ خودنمائی کے جذبے کے تحت چادر اور چار دیواری سب سے فارغ ہو جاتی ہے۔ ماں تو شاید چادر بھی اوڑھتی ہو مگر بیٹی کو نہ چادر میں دلکشی نظر آتی ہے' نہ شرم و حیا کا پاس رہتا ہے۔ اور معاملہ بگڑنا شروع تب ہوتا ہے جب اولاد کی تعلیم و تربیت کا ذمہ امریکن سکولوں کو دے دیا جاتا ہے۔ اب وہاں عربی تو پڑھائی جائے گی نہیں' البتہ English language ضرور ہو' مخلوط تعلیم ہو' کیونکہ لڑکے اور لڑکیاں الگ الگ پڑھیں تو ان میں اعتماد نہیں آتا۔ لباس کا بھی اللہ ہی حافظ ہے' اور آج کل تو مونٹیسوری سے ہی Birthday' Mother's day' Father's day' Valentine's day' Christmes' Santa Clause اور Haloween کے بارے میں بچوں کو بتانا شروع کر دیا گیا ہے' اور مائیں اتنی بے خبر اور بے فکر ہیں کہ جب انہیں ہوش آتا ہے تو پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ اور اب تو ان سکولوں کے نصاب میں جنسی آگہی کے اسباق بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ بیٹی جوانی کی حدود پر قدم رکھتی ہے تو آزادی مانگتی ہے' اب اسے ماں اور باپ backward ہی لگیں گے۔

پھر ہمارے کالجز اور یونیورسٹیوں کا حال ہم سب کے سامنے ہے۔ وہاں تو لڑکے لڑکی کو تنہا ہونے کے کھلے مواقع ہیں اور پھر ایسے ایسے گُل کھل رہے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ یوں لگتا ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے روحانی قتل گاہیں اور اخلاقی اقدار کا قبرستان ہیں۔ سکولوں سے ہی بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ کالج یونیورسٹی تک پہنچتے پہنچتے سنگین صورتحال اختیار کر جاتا ہے اور ہماری لڑکیاں جنس مخالف کی توجہ کا مرکز بننے کے لیے ہر حربہ آزماتی ہیں۔ میک اپ' بناؤ سنگھار' باریک' چست اور مختصر لباس' خوشبویات کا استعمال کر کے فحاشی اور بے شرمی کے ریکارڈ قائم ہی نہیں کر رہیں' بلکہ توڑ رہی ہیں۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ یہ لڑکیاں آخر چاہتی کیا ہیں؟ خودنمائی کی خواہش بھی ان میں شدید ہے۔ کوئی مرد اگر ان کو نہ دیکھے تو بعض لڑکیوں کو یہ طعنے دیتے بھی سنا گیا ہے کہ ''بہت ہی شرمیلا ہے'' یا ''بالکل مولوی ہے'' اور وہ جو انہیں بے باک اور ہوس بھری نگاہوں سے گھوریں' آوازے کسیں یا پھر اغوا ہی کر لیں تو واویلا ہے کہ ''عورت مظلوم ہے'' اور ''مرد درندے اور بھیڑیے ہیں'' — کاش پہلے ہی ہوش کر لیتیں!!

عورت' بحیثیت بیوی

اب یہاں ذکر ان عورتوں کا جو مسلمان بیویوں کے طور پر اپنے فرائض نبھانے میں

غفلت برت رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میری باتیں بہت سی عورتوں کو پسند نہیں آ رہیں' لیکن بات کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تو رحمۃ للعالمین تھے۔ آپؐ نہایت رحمدل اور نرم خو تھے۔ چنانچہ آپؐ نے ہم خواتین کو ''آبگینوں'' سے تشبیہہ دی ہے اور مَردوں کو تلقین کی ہے کہ ہم عورتوں کے بارے میں محتاط رہیں۔ لیکن دوسری طرف ہم کو بھی چاہیے کہ اپنے پیارے نبی ﷺ اور ان کی ازواجِ مطہرات و بنات رضی اللہ عنہن کے اُسوۂ حسنہ پر عمل کریں اور اپنے محرم اور نامحرم مَردوں کے لیے فتنہ اور آزمائش نہ بنیں۔ ہمارے نبی ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ جہنم میں عورتیں زیادہ ہوں گی' ایک تو ناشکری اور دوسرے دین کے فہم میں کم ہونے کی وجہ سے۔ ان شاء اللہ' ہم بھرپور کوشش کریں گی کہ غلطیوں کو نہ دہرائیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری اختیار کریں۔

اب کچھ ذکر عورت کی ازدواجی زندگی کا۔ سب سے پہلا بگاڑ تو شادی بیاہ کی رسومات سے شروع ہوتا ہے' یعنی پہلا قدم جب ایک عورت بیوی کے رتبے پر فائز ہونے جا رہی ہے' اس موقع پر کوئی رسم سنتِ رسولؐ کے مطابق نہیں۔ دوہرا ستم یہ کہ رخصتی کے موقع پر قرآن کے نیچے سے دلہن گزار دی جائے۔ برا نہ منائیں' یہ ایک علامت ہے اس بات کی کہ قرآن کو سمجھنے کی ضرورت نہیں' سر سے اوپر اوپر ہی رکھو' نیچے جو مرضی کرو۔ جہیز' پہناوٗنیوں کا تصور یہ سب عورت کے ذہن کی ہی خرافات ہیں۔ کہیں ساس صاحبہ جہیز کے ٹرک لے کر بھی مطمئن نہیں ہوتیں اور کسی چیز کے پرانے اور کسی کے خراب ہونے کا طعنہ بہو کو دیتی ہیں تو کہیں سسرال والوں کے انکار کے باوجود لڑکی اور اس کی ماں جہیز اکٹھا کرتی ہیں کہ برادری میں ناک کٹ جائے گی۔ غور کریں کہ یہ سب عورت ہی کے روپ ہیں۔ کچھ ساس نندوں کی چغلیاں' کچھ لڑکی کی کم ظرفی' شوہر کی ناشکری' لگائی بجھائی اور عورت کی عورت سے نفرت! ان سب کے دوران پھر وہ وقت آتا ہے جب چولہے پھٹتے ہیں اور بہو جلتی ہے' مٹی کا تیل چھڑک کر لڑکی زندہ جلا دی جاتی ہے' تیزاب پھینکا جاتا ہے اور کم سے کم طلاق تو ضرور ہی ہوتی ہے۔

اس کے برعکس اگر بیوی صبر و تحمل سے وقت گزارے تو اللہ تعالیٰ بہتر صورت ضرور نکالے گا۔ شوہر سے موڈ خراب رکھنا' اس کی جائز ضروریات سے انکار کرنا' خاص طور پر حق زوجیت سے انکار' اپنے والدین' ہمسایوں اور سہیلیوں سے شوہر کی چغلیاں اور سسرال والوں کی غیبت کرنا اور پھر یہ کہنا کہ کیا کریں عورت ہمیشہ سے مظلوم ہے' اب تو صبر ہی کرنا ہے!! یہ صبر ہرگز نہیں ہے — اور اسی پر بس نہیں' جزع فزع کے علاوہ غیبت' بدگمانی' تجسّس (یہ سب ممنوع ہیں ایک مسلمان کے لیے۔ سورۃ الحجرات کا مطالعہ کریں) اور سب سے بڑھ کر دوسروں کے

شوہروں پر نظر رکھنا کہ فلاں کا شوہر تو اتنا اچھا ہے' بیوی کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے' ہر موسم میں چار پانچ نئے سوٹ لے کر دیتا ہے' تحفے بھی دیتا ہے' تم کو تو میرا خیال ہی نہیں۔ اور خود بیویوں کا اپنا حال یہ ہے کہ چھابڑی والے سے لے کر ڈاکٹر تک کے پاس جانے کے لیے بہترین کپڑے زیب تن کر کے' میک اپ کر کے' خوشبویات کا استعمال کر کے اور نفاست سے کنگھی چوٹی کا اہتمام کریں گی اور شوہر گھر میں داخل ہوگا تو سر پر پٹی بندھی ہوگی اور واہی تباہی اور ہائے وائے کا ورد جاری ہوگا۔ اب شوہر کا دھیان لامحالہ اپنے آفس میں اور باہر نظر آتی آپ جیسی ہی بنی سنوری عورتوں کی طرف جائے گا جو صرف دوسروں ہی کے لیے سجتی ہیں اور جن کی مسکراہٹ صرف غیر مَردوں کے لیے ہی ہوتی ہے۔

یہ اسی طرزِ عمل کا نتیجہ ہے کہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے' گھر کے کام کاج بارِ گراں اور بچوں کو سنبھالنا عذاب لگتا ہے اور نفسیاتی دباؤ کی وجہ سے نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ سدھار کی طرف توجہ دینے کی بجائے پھر ہمارے معاشرے کی مسلمان بیوی کوئی نہ کوئی فورم تلاش کرتی ہے جو آج کل میڈیا کی مہربانی سے بہت آسان ہو گیا ہے اور واویلا کرتی ہے کہ میں مظلوم ہوں!

چند غور طلب باتیں

(۱) یہ بات مشہور ہے کہ عورت مرد سے زیادہ محنتی ہے اور ہر فیلڈ میں مَردوں سے بڑھ کر کام کرتی ہے۔ بے شک اللہ عزوجل نے عورت میں بے پناہ صلاحیتیں رکھی ہیں' لیکن وہ مَردوں کے درمیان گھس کر کام کرنے کے لیے نہیں ہیں' بلکہ اس سے بڑا کام اس کے ذِمے ہے اور وہ ہے بہترین نسل انسانی کو پروان چڑھانا۔ لہٰذا اپنی صلاحیتوں کے جوہر گھر میں دکھائیں۔

(۲) اپنے آپ کو نامحرم مَردوں کی نظروں سے بچانا آپ کا حق ہے۔ جنت کی سردار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت الرسول ﷺ نے کہا تھا: ''بہترین عورت وہ ہے جسے نہ کوئی نامحرم دیکھے اور نہ وہ کسی نامحرم کو دیکھے اور وہ اپنی خوبصورتی اور سنگھار صرف اپنے شوہر کے سامنے ظاہر کرے۔''

(۳) تعلیم اور مہارت حاصل کرنے میں پردہ رکاوٹ نہیں ہے۔ ایک عورت پردے میں رہ کر بہترین ڈاکٹر' نرس اور ایک مشفق ٹیچر بن سکتی ہے' لیکن صرف عورتوں کے لیے۔

(۴) بازاروں اور سڑکوں پر بن ٹھن کر نکلنا آپ کو خوبصورت نہیں بناتا۔ صرف ضرورت کے تحت اور مکمل حجاب میں نکلیں تاکہ ستائی نہ جائیں اور مظلوم نہ کہلائیں۔

مسلمان عورت' مغربی دنیا میں اسلام کی عزت کی ضامن

مغرب کا اسلام پر دیگر تمام اعتراضات کے علاوہ ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ عورت کو چار دیواری میں قید رکھنا اور برقع کی پابندی وغیرہ عورت پر ظلم ہے۔ اس اعتراض کا جواب ہم عورتیں بخوبی دے سکتی ہیں۔ ایک طریقہ تو وہ ہے جو عورت کی ذاتی زندگی کے ضمن میں سامنے آیا ہے۔ دوسرے وہ قواعد وضوابط ہیں جو ضرورت کے تحت باہر نکلنے کی صورت میں اسلام عورت پر عائد کرتا ہے۔ چونکہ عورت ایک نازک آبگینہ اور قیمتی ہوتی ہے لہٰذا ہمارا اسلام چاہتا ہے کہ وہ چھپی رہے اور نظروں میں نہ آئے۔ اگر باہر نکلنا ہو تو مضبوط حصار میں۔ اور وہ حصار ہے ہمارا ''پردہ'' جسے رب نے ہمارا یونیفارم قرار دیا ہے۔ عورت کا اصل حسن' عزت اور اسلام کی شان اسی میں ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہر ادارے اور سکول وغیرہ کے اپنے قواعد وضوابط ہوتے ہیں اور یونیفارم کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ تو ہمارے رب کی کائنات میں رب کا نظام چلنا زیادہ ضروری ہے اور اگر ہم خلاف ورزی کریں گے تو جو آج مسلمان اور اسلام کی رسوائی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ہم مسلمان خاص طور پر خواتین خود پردے کو تنگ ذہنیت اور فرسودہ احکامات سمجھتے ہیں۔ اسلامی سزاؤں' پابندیوں اور تعزیرات کو ظالمانہ سمجھتے ہیں اور مغرب کو کامیاب اور قابلِ تقلید سمجھتے ہیں تو دوسروں کو کیا پڑی ہے کہ وہ اسلام کو عزت کی نظر سے دیکھیں۔ جبکہ اگر ہم دل سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کو تسلیم کریں تو دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کا بول بالا پھر ہو جائے گا۔

خواتین کے لیے چند تجاویز

اب کچھ تجاویز عورتوں کے لیے' جن پر اگر عمل کر لیا جائے تو اگلے سال' ان شاء اللہ' عورتوں کا عالمی دن ایک مختلف طریقے سے منایا جائے گا:

(۱) خواتین' چاہے اَن پڑھ ہوں' ملازمت پیشہ ہوں یا پڑھی لکھی اعلیٰ ملازمت یافتہ ہوں' ان کو شریعت کے احکامات' ان کے حقوق اور ان کے فرائض سب سے آگاہ کیا جائے اور ان پر عمل کرنے کی تاکید ہو۔ تاکہ ہر خاتون اپنے حالات کے مطابق صرف ضرورت کے تحت گھر سے نکلے اور نکلنے کی صورت میں پردے کے احکامات پر سختی سے عمل پیرا ہو۔

(۲) حقوق وفرائض کے ساتھ بہترین اخلاقی تعلیم وتربیت کی جائے۔ اُمہات المؤمنین' بناتِ رسول اور صحابیات رضی اللہ عنہن کے واقعات کتابی صورت میں شائع کر کے کورس کی طرح سکھائے جائیں اور عمل کے طریقے بتائے جائیں۔ تعلیم کے میدان میں بھی ان کو

ایم اے اسلامیات' ایم اے عربی اور سوشل سائنسز وغیرہ میں آگے بڑھایا جائے۔

(۳) عورتوں کے لباس پر خصوصی توجہ دی جائے۔ چھوٹی معصوم بچی کو ساتر لباس پہنایا جائے تاکہ اس کی شرم و حیا برقرار رہے۔ جوانی میں مستور لباس کیسا ہو اور حجاب کب لازم ہے؟ یہ سب اور اس کے علاوہ ستر اور حجاب کے تمام احکامات اور محرم اور نامحرم مردوں کی تفصیل پڑھائی جائے۔

(۴) مائیں اپنے بیٹوں اور بھائیوں کی تربیت میں شرم و حیا کو ملحوظ رکھیں۔ ان کو ماؤں' بیٹیوں' بہنوں اور بیویوں کے حقوق کے بارے میں بتانا' پردے کے احکامات کا شعور دلانا اور غضِ بَصر کا سختی سے حکم دینا' ماؤں کی ذمہ داری ہے۔ کیونکہ ستر و حجاب اور غضِ بَصر کے احکامات صرف عورتیں پورے نہیں کرسکتیں جب تک کہ مردوں کا تعاون شامل نہ ہو۔

(۵) تمام مرد اپنی ماؤں' بیویوں' بیٹیوں اور بہنوں کے ساتھ حسنِ سلوک کریں۔ نبی پاک ﷺ کے احکامات کے مطابق سکون' محبت' پیار اور مؤدت کے ساتھ رہیں اور عفو و درگزر سے کام لیں۔ خاندانی نظام مضبوط ہوگا تو ہی معاشرہ مضبوط ہوگا۔

اس تحریر کو پڑھنے کے بعد یہ بات تو آپ پر واضح ہو چکی ہے کہ دنیا میں اپنی بے عزتی و رسوائی کی ذمہ دار ہم عورتیں خود ہیں۔ ہمارا دائرہ کار اسلام نے گھر اور بچے کو قرار دیا ہے۔ اگر ہم اپنی زیب و زینت کو اپنے شوہروں تک محدود رکھیں (محرم مردوں کے سامنے بھی صرف چہرے کی ٹکیا کھلی ہو)' اور ہم عورتیں گھر میں رہتے ہوئے مشکلات کا سامنا صبر سے کریں' اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں' قناعت سے شوہر کی شکرگزاری کرتے ہوئے زندگی گزاریں اور اسی حال میں اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں تو ان شاءاللہ جنت ہمارا مقدر ہوگی اور یہ ان ذلتوں اور رسوائیوں سے بہتر ہے جو مندرجہ بالا تمام اعمال نہ کرنے کی وجہ سے ملیں گی۔

حرفِ آخر

اس بات کو بھی ہمیشہ یاد رکھیں کہ موت ہر ایک کو آنی ہے اور بحیثیت مسلمان ہمیں اس بات پر یقین ہونا چاہیے کہ مر کر مٹی میں نہیں ملنا بلکہ اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہونا ہے۔ اگر دنیا میں ہمارا آئیڈیل مغربی دنیا کے اداکار اور اداکارائیں ہوں یا ہندو معاشرے کی روایات کو ہم سینے سے لگا کر رکھیں گے تو آخرت میں انہی یہودیوں' عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے۔ (**اعاذنا اللّٰہ من ذٰلك!**) لہٰذا دنیا کی رسوائی کو برداشت کرلیں' لیکن خدارا اُسوۂ حسنہ اور امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے اُسوہ پر عمل کریں تاکہ ہمارا حشر ان روشن ستاروں کے ساتھ ہو۔ ان شاءاللہ!

❁❁❁

بقیہ : عرضِ احوال

درمیان تلخی آ چکی ہے' یہاں تک کہ ایران پاکستان کے اندر کارروائی کی دھمکی دے چکا ہے۔

قصہ مختصر جس اُمتِ مسلمہ کو جسد واحد ہونا چاہیے تھا اور جسے نبی مکرم ﷺ اس طرح دیکھنا چاہتے تھے کہ اس کے ایک حصہ میں تکلیف ہو تو دوسرا حصہ بھی بے تاب ہو جائے' افسوس وہ اُمتِ مسلمہ ایک عرصہ سے کئی ممالک میں تقسیم ہو چکی ہے۔ اب یہ مسلمان ممالک باہم دست و گریبان ہیں اور ان کے درمیان جنگیں بھی ہو چکی ہیں۔ پھر یہ کہ مسلم ممالک میں حکومت اور اپوزیشن کے مابین اختلافات ذاتی دشمنی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کئی ممالک میں خونی انقلاب برپا ہو چکے ہیں۔ کہیں حکومت اپوزیشن کے خلاف غیر مسلم حکومتوں سے مدد مانگتی ہے اور کہیں اپوزیشن انہیں اپنے ملک میں مداخلت کی دعوت دیتی ہے۔ بہرحال مسلمانوں کے درمیان کہیں مذہبی اور فرقہ وارانہ منافرت ہے اور کہیں سیاسی رسّہ کشی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔

آیئے اب اپنے پیارے ایٹمی پاکستان کے حالات کا کچھ تذکرہ کرتے ہیں جو سب سے نرالا اور منفرد ہے اور جس کی فوج پیشہ وارانہ مہارت اور بہادری کے حوالہ سے دنیا میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ کبھی پاکستانی مسلمانوں کا مقبول ترین نعرہ ''پاک فوج زندہ باد'' ہوتا تھا۔ آج اسلام دشمن قوتیں پاکستان کی عوام اور فوج کے مابین اتنی وسیع خلیج حائل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہیں کہ فوجی جوانوں کو جب عوام میں آنا ہوتا ہے تو وہ وردی پہن کر نہیں آتے تاکہ ان کا فوجی ہونا کسی کو معلوم نہ ہو سکے۔ فوج کچھ لوگوں کو دہشت گرد قرار دے کر ہلاک کر رہی ہے اور یہ لوگ فوجی جوانوں کو اسلام دشمن کہہ کر قتل کر رہے ہیں۔ بھائی کے ہاتھوں بھائی قتل ہو رہا ہے۔ کوئی اسلام کا نام لے کر خون بہا رہا ہے تو کوئی حکومتی رٹ قائم اور بحال کرنے کو جواز بنا کر انسانوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح کچل رہا ہے۔ پرویز مشرف نے جس آگ کو سلگایا تھا اور سابق صدر زرداری نے جس پر تیل چھڑکا تھا آج وہ پورے پاکستان کو جھلسا رہی ہے۔ دونوں حکمران بھارت سے مذاکرات کے لیے تو اُس کی منت سماجت کرتے رہے' لیکن اپنے ناراض بھائیوں سے بات کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بھارت سے مذاکرات کے لیے تو موجودہ نواز شریف حکومت بھی بچھی جا رہی ہے' لیکن ساتھ ساتھ اس نے تحریک طالبان پاکستان کو بھی مذاکرات کی طرف دعوت دی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں اس حوالہ سے نواز شریف کو خراجِ

تحسین پیش نہ کرنا بخیلی کا مظاہرہ ہوگا کہ وہ غیر ملکی اسلام دشمن قوتوں کے ساتھ ساتھ اندرونِ ملک سیکولر عناصر (جو آستین کے سانپ بنے ہوئے ہیں) کا شدید دباؤ برداشت کرتے ہوئے تحریک طالبان پاکستان سے مذاکرات جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہم دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہیں کہ یہ مذاکرات کامیاب ہوں۔ اسلام اور پاکستان کے دشمن ان مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

ان حالات میں اور اس عالمی پس منظر میں اسلام دشمن قوتوں کا کامیاب مقابلہ کرنا اور مسلمانوں کا ایک قوت کی حیثیت سے اُبھرنا عقل وفہم کے حوالہ سے اور ہر قسم کی سوچ وفکر کے نتیجہ میں ناممکن نظر آتا ہے' لیکن آج سے قریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس دنیا میں جنم لینے والی کائنات کی عظیم ترین ہستی یعنی اللہ کے آخری رسول ﷺ نے فرمایا تھا کہ قیامت سے پہلے مسلمانوں کو عالمی غلبہ حاصل ہوگا' لہٰذا ہمارے عقل وفہم اور سوچ وفکر کی کیا حیثیت' ہمیں تو اپنے سر کی آنکھوں سے نظر آنے والی شے سے زیادہ فرمودۂ رسول ﷺ پر یقین ہے۔ یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ لہٰذا کب ہوگا؟ اور کیسے ہوگا؟ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے' لیکن آنے والے وقت میں اسلام کا عالمی غلبہ ہوگا یہ نوشتہ دیوار ہے' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ تو ہونی اور شدنی ہے کہ ہو کر رہے گی۔ اصلاً ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ اس عظیم ترین کام میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہوگا یا ہم محروم رہیں گے! اس لیے کہ ظاہر ہے اپنا فیصلہ صادر کرنے کے لیے نہ اللہ پہلے خود زمین پر اترا نہ کبھی اترے گا۔ پہلے بھی اس نے یہ کام اپنے بندوں سے لیا تھا' اب بھی اس کے بندے ہی یہ کارنامہ سرانجام دیں گے۔ کیا ہم اس بوجھ کو اٹھانے میں اپنے کندھے آگے کریں گے یا محرومین میں سے اور پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوں گے؟ خدارا غور کریں اس بات پر کہ اگر ایک مردہ سنت زندہ کرنا سو شہیدوں جیسا ثواب کمانا ہے تو پورے نظامِ اسلام کو زندہ کرنا اور دین کی حیثیت سے نافذ کرنا کتنا عظیم کام ہوگا! اور وہ اول وآخر کا مالک اور ظاہر و باطن کا جاننے والا اور غالب قوت کا مالک اللہ ربّ العزت اس پر کیسے اجر سے نوازے گا' اس عارضی دُنیوی زندگی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے پہلے کسی ایک اسلامی ملک میں یہ نظام نافذ کرنا ہوگا' پھر اُمتِ مسلمہ کو یکجا کرنا ہوگا۔ تب بنے گا وہ جسد واحد جس کے ایک حصے کی تکلیف دوسرے حصے کو بے چین اور بے تاب کر دے گی۔ حق کی اس قوت سے ٹکرانا باطل کے بس کی بات نہیں ہوگی اور اللہ کی حکومت آسمانوں کے علاوہ زمین پر بھی پورے جاہ و جلال سے قائم ہوگی—— ان شاء اللہ!

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع !

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں:

۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لیے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے' اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی۔

۲) عربی گرامر خط و کتابت کورس (I,II,III)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لیے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لیے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-35869501

Email: distancelearning@tanzeem.org

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

دینی و عصری علوم کی منفرد دانش گاہ

کُلّیۃ القرآن (قرآن کالج)

(وفاق المدارس سے الحاق شدہ)

بانی: ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

بورڈ / یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ درسِ نظامی کا مکمل نصاب

قیام و طعام کی سہولت موجود ہے

علمِ دین اور فکرِ حاضر کے حسین امتزاج کی ایک منفرد کوشش

خصوصیات

- ☆ تجربہ کار، اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرسین
- ☆ قرآنی موضوعات پر خصوصی فکری و عملی رہنمائی
- ☆ تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام
- ☆ طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے بہترین مواقع
- ☆ علوم اسلامیہ کے ساتھ جدید علوم یعنی درس نظامی مع میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے
- ☆ اسباق وفاق المدارس العربیہ اور لاہور بورڈ کے نصاب کے مطابق
- ☆ خوبصورت عمارت اور کلاس رومز
- ☆ کمپیوٹر لیب ☆ بہترین اور مکمل لائبریری
- ☆ کانفرنس اور مذاکرہ ہال
- ☆ اسلامی اخلاقیات کی مکمل پابندی
- ☆ رہائش کے لیے بہترین ہوادار اور روشن کمرے
- ☆ خوراک حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق
- ☆ طلبہ کی تدریسی ضروریات پوری کرنے میں معاونت
- ☆ وقت کا مؤثر استعمال
- ☆ مواقع تفریح کی فراہمی

نشستیں محدود ہیں!

مڈل کے امتحان کے نتائج کے منتظر طلبہ بھی درخواست جمع کرا سکتے ہیں

مقامی و دیگر شہروں کے طلبہ کے لیے درجہ اولیٰ و ثانیہ (میٹرک) اور ثالثہ میں نئے تعلیمی سال کے داخلے جاری ہیں

داخلے جاری ہیں!

انٹری ٹیسٹ و انٹرویو:۔ 5 اپریل 2014ء بوقت 10 بجے صبح

کلاس کا آغاز:۔ 7 اپریل 2014ء بوقت صبح 7:30 بجے

معلومات داخلہ

- ☆ نئے سال کے لیے داخلہ کے خواہش مند طلبہ کلیۃ القرآن آفس سے داخلہ فارم اور انٹری ٹیسٹ کے لیے سلیبس وصول کر سکتے ہیں۔
- ☆ داخلہ کے لیے انٹری ٹیسٹ اور انٹرویو پاس کرنا لازمی ہے
- ☆ مزید معلومات کے لیے ناظم اعلیٰ کلیۃ القرآن یا نائب ناظم سے رابطہ کریں!
- ☆ امسال شوال میں داخلے نہیں ہوں گے۔

شرائط داخلہ

- ☆ درجہ اولیٰ کے لیے متوسطہ یا مڈل پاس' ثانیہ کے لیے نہم اور اولیٰ پاس اور ثالثہ کے لیے وفاق المدارس سے عامّہ اور بورڈ سے میٹرک پاس ہونا لازمی ہے۔
- ☆ دیگر تعلیمی اداروں سے کم از کم مڈل
- ☆ اپنے علاقے کے عالم دین سے یا سابقہ مدرسہ سے تصدیق نامہ
- ☆ سرپرست کی طرف سے ضمانت نامہ
- ☆ ٹیسٹ اور انٹرویو میں کامیابی

برائے رابطہ

ناظم اعلیٰ **کُلّیۃ القرآن** (قرآن کالج)

191۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

فون: (042)35860024-35833637

پرنسپل: طارق مسعود 0321-4506196

ذیلی دفتر: **قرآن اکیڈمی**

36-K ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ فون: (042)35869501-3

فیکس: (042)35834000، ای میل: irs@tanzeem.org